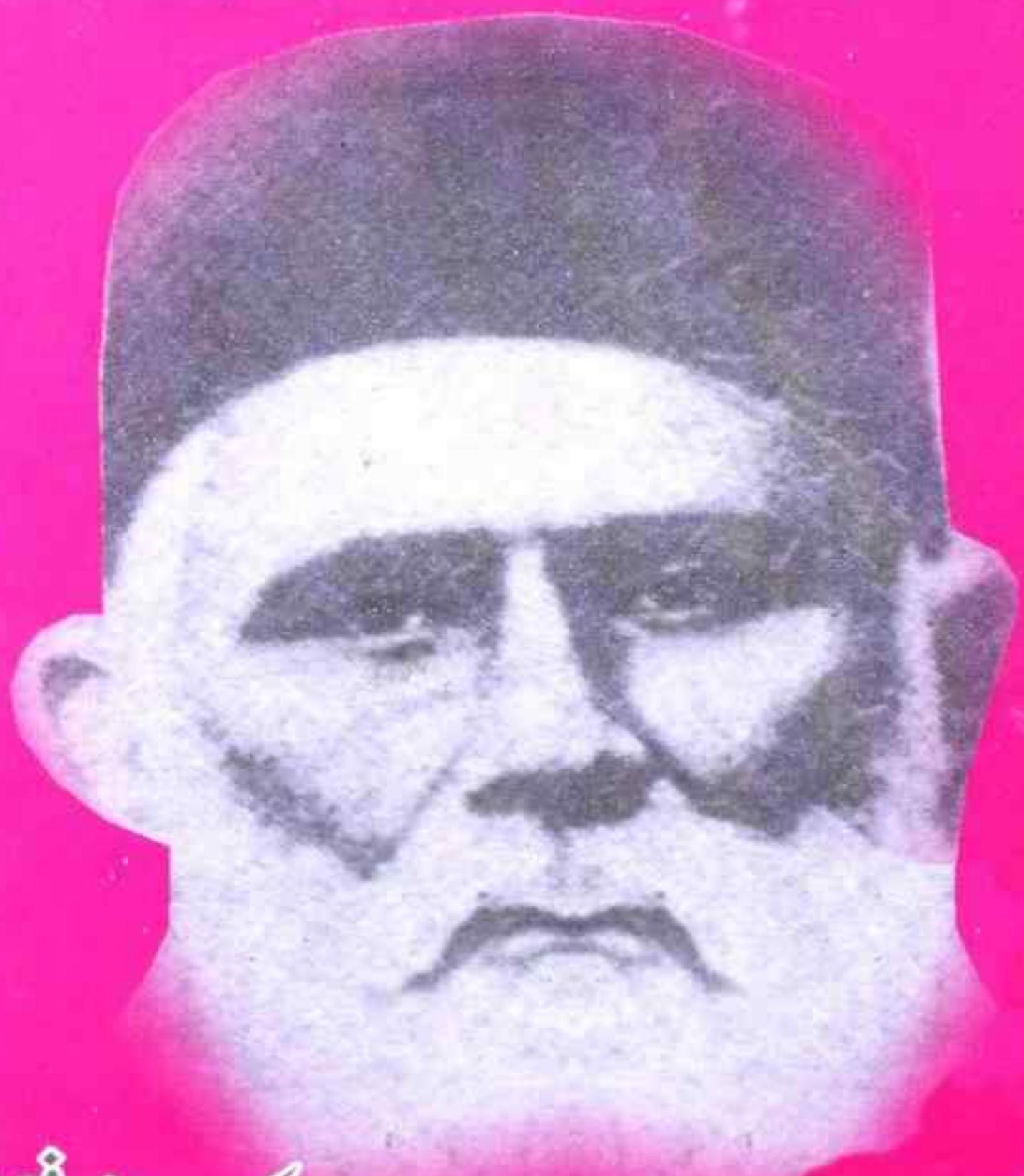


# حائل کی سوانح نگاری

حیات جاوید کی روشنی میں



ملک راشد فیصل

لیکچر سرل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

# حآل کی سوانح نگاری

حیات جاوید کی روشنی میں

ملک راشد فیصل

ای بھوکھشناز پر پاٹنگ ہاؤس، دہلی۔

**HALI KI SAWANEH NIGARI  
HAYAT-E-JAVED KI ROUSHNI MEIN**

by

**Malik Rashid Faisal**

Year of 1<sup>st</sup> Edition 2007

ISBN 81-8223-253-8

Price : Rs 100/-

نام کتاب	حآل کی سوانح نگاری—حیات جاوید کی روشنی میں
مصنف	ملک راشد فیصل
پتہ	K-101، فلیٹ نمبر 11، ابو افضل انکلیو پارٹ وان، جامعہ، اوکھلا، نئی دہلی - २५
سناشاعت	۲۰۰۷ء
قیمت	100 روپے
مطبع	عفیف آفیس پرنسپلز، دہلی

Published by

**EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE**

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-011-23211540

E-mail: ephdelhi@yahoo.com

# النٰسَاب

امی

اور

ابو

کی بے لوث محبتوں اور قریبانیوں

کے نام



## فہرست

۷	ملک راشد فیصل	پیش لفظ
۱۱		باب اول
۳۳	سوخ نگاری اور اس کافن	
۵۹	سوخ نگاری کا ارتقاء۔ حالی کے عہد تک	باب دوم
۱۰۲	حالی کی سوخ نگاری کا تنقیدی جائزہ	باب سوم
۱۱۰	حیات جاوید کی روشنی میں	باب چہارم
		خلاصہ
		کتابیات



## حالی کی سوانح نگاری

حالی ز نواہاے جگر سوز نیا سوو  
تالالہ شبنم زده را داغ جگر داد

اقبال



## پیش لفظ

الطا ف حسین حالی کی حیثیت اردو ادب میں ایک مجدد کی ہے جنہوں نے نہ صرف اردو شاعری اور اردو تنقید کو جدید تفاضلوں سے آشنا اور سیراب کیا بلکہ اردو سوانح نگاری کو بھی اپنے قلم سے وہ تو اتنا لی دی جس سے اس کا باقاعدہ شعوری طور پر آغاز ہوا۔ ”مسدس حالی“ اور ”مقدمہ شعرو شاعری“ کے نام و اہمیت سے تو اردو کا ایک نو خیز طالب علم بھی واقف ہوتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ان کے بغیر شاعری اور خصوصاً تنقید میں ایک قدم بھی چلنا دشوار ہے۔ اردو تنقید کی پوری عمارت حالی کی تنقید پر قائم ہے جسے الگ کر دینے سے پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ ”مسدس حالی“ کی اہمیت وعظمت سر سید جیسے مصلح قوم کے اس قول سے وابستہ کی جاتی ہے کہ یہی آخرت میں میری نجات کا ذریعہ بنے گی۔ غرض یہ کہ ادبی نقادوں نے حالی کی شاعری و تنقید کے ضمن میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔ مگر ان کی سوانح نگاری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ ان کی سوانح نگاری کے حسن کوشیلی جیسے معارض بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اردو میں سوانح نگاری کے فن کے لیے ادباء و نقاد ہیں نے جو معیارات مرتب کیے ہیں ان کی پاسداری سوانح نگار کا فرض اولین ہے۔ حالی نے جب اس مشکل اور پیچیدہ وادی میں قدم رکھا اُس وقت ان کے سامنے فن سوانح نگاری کے اصول و قوانین واضح نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیت اور کوششوں سے اردو میں سوانح نگاری کی باقاعدہ بنیاد ڈالی اور بالواسطہ اس کے اصول مرتب کیے۔ اس ضمن میں حالی کی کاؤشوں کو قارئین کے سامنے پیش کرنے

کی جسارت کر رہا ہو۔

میں نے اس کتاب میں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ حیات جاوید سے متعلق حالی کی فنی و نساحت کے اصل حقائق کو سامنے لاوں تاکہ راہ پاؤں غلط فہمیوں اور اعتراضات کا ازالہ کیا جاسکے۔ لیکن محض اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ زیر تنقید کتاب میں واقعی جو فنی خامیاں ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ظاہر ہے ادب میں کوئی بھی تصنیف یا تالیف حرف آخر نہیں ہوتی۔ بشریت کا تقاضا ہے کہ غلطیاں سرزد ہوں لہذا انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالی کی سوانح نگاری کو بھی فنی خامیوں سے یکسر بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ اس کتاب میں ان کی طرف بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

اردو ادب کی ابتداء سے آج تک اگر نشری تصنیف پر زگاہ ڈالی جائے تو خالص سوانح عمریاں ہمیں حالی اور ان کے بعد سے ہی ملتی ہیں ورنہ نیم سوانحی کتابیں اور سوانحی منتشر عناصر دکن کی منظوم مثنویوں سے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ حالی نے پہلی بار مغربی اصول و نقد سوانح نگاری کو ”حیات جاوید“ میں جگہ دی۔ یہاں یہ بات پچپکی سے خالی نہ ہو گی کہ حالی انگریزی زبان سے واقف نہیں تھے بلکہ انہوں نے انگریزی کتابوں کے اردو و تراجم کی مدد سے مغربی ادب سے واقفیت حاصل کی تھی۔ حالی سے قبل اردو میں مشرقی طرز کی سوانح عمریاں ملتی ہیں جن میں امراء، روساء، ملوک اور دیگر مذہبی شخصیات کے مختلف گوشوں پر غیر منظم طریقے پر خامہ فرمائی کی جاتی تھی اور کسی طرح کے اصول و ضوابط کی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مدح و ذم کے خود تیار کردہ معیار ہوتے تھے۔ کوئی کسی کی بے جامدح سر ای کرتا تھا تو کوئی کسی کی بے جامد مت پر اتر آتا تھا۔ حالی نے اس روایت کو توڑا اور اردو سوانح نگاری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے اپنی پہلی دونوں سوانحوں ”حیات سعدی“ اور ”یادگار غالب“ میں اپنے ہیرو کے پھوڑوں کو کہیں سمجھیں لگانے نہیں دی۔ (اس کا ذکر انہوں نے حیات جاوید کے دیباچے میں کیا ہے) کیونکہ ان کا زمانہ اور سوانح کے موضوعات اس کے متحمل نہیں تھے اور ان کے پیش نظر افادی مقاصد تھے۔ جہاں تک ان کی آخری تصنیف حیات جاوید کا تعلق ہے تو اس کے ہیرو سید احمد خاں کی شخصیت

نے انہیں مہمیز کیا کہ وہ نکتہ چینی کی بنیاد ڈالیں تاکہ ہیرو کی ذات عوام کے سامنے نکھر کر آجائے اور بے جا اختلافات کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں رقم الحروف نے یہ کوشش کی ہے کہ حالی کے حد درجہ خلوص و صداقت کو دکھایا جائے۔ اس بات کو زیادہ تر نقاید تسلیم کرتے ہیں کہ حیات جاوید جدید طرز کی پہلی منظم سانچنک سوانح عمری ہے۔

میں نے کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں سوانح نگاری کی تعریف اور اس کے فن پر روشی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے آخر میں سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری کا فرق واضح کیا ہے نیز سوانح عمری کے اسلوب پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

دوسرے باب میں سوانح نگاری کا ارتقا حالی کے عبید تک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس منظر کے طور پر عربی و فارسی سوانح نگاری کا ذکر بھی کیا ہے۔ اردو سوانح نگاری کی بابت میں نے دُن کے بعد شامی ہند کے تذکروں اور دیگر سوانحی اصناف کا ذکر انتصار کے ساتھ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ارتقائی عمل کو دکھانے میں تاریخی کڑیوں کو ملانے کی ضرورت ہوتی ہے میں نے اس کا خیال رکھا ہے۔ عبید حالی میں حالی اور تسلیکی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اور دیگر سوانح نگاروں ذکاء اللہ، عبد الحليم شریر، نذر احمد کی سوانحی کوششوں کو محض چند جملوں کے بیان پر ہی اکتفا کیا ہے۔

تمیرے باب کے ذیل میں سب سے پہلے حالی کی شخصیت، سیرت اور سر سید سے ان کے تعلق کو مختصر آپیش کیا ہے۔ بعد ازاں سر سید کی عظمت جو ایک سوانح کے ہیرو کے لیے درکار ہوتی ہے بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے فوراً بعد اپنے اصل موضوع ”حیات جاوید“ کے تنقیدی جائزہ کا رخ کیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف اعتراضات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اخیر میں حیات جاوید کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

چوتھا باب خلاصے پر مشتمل ہے جس میں سارے ابواب کا انتصار کے ساتھ نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی میری یہ کوشش اردو ادب کے بحاذ خار میں ایک قطرے کی بھی دیشیت نہیں رکھتی لیکن موضوع کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرتا

ہوں کہ میرے اس کام کی طرف توجہ دی جائے گی اور خامیوں کی نشان دہی بھی کی جائے گی۔

باجمی تعاون کے بغیر کسی کام کا مکمل ہونا دشوار گزار ہوتا ہے چنانچہ میرے اس کام کو میرے اساتذہ، رفقاء، احباب اور عزیز واقارب کی مدد اور ان کے خلوص و محبت نے بہت آسان کر دیا۔ خصوصاً استاد محترم پروفیسر محمد شاہد حسین کی شفقت اور خصوصی توجہ سے ہی یہ کام پایی تکمیل تک پہنچ سکا ہے ورنہ اپنی بساط اس راہ رو کی ہی تھی جو راستہ دشوار دیکھ کر، سفر شروع کرنے سے پہلے ہی ہمت ہار جاتا ہے۔ علی گرد ہم مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر اصغر عباس نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ان کے مشوروں اور ہمت افزائی کے لیے تدل سے ان کا ممنون ہوں۔ میں مولانا آزاد لاہوری کے اردو سیکشن کے ذمے دار جناب میر باقر حسین صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے میری ضرورت کے مطابق کتابیں فراہم کیں۔ اخیر میں اپنے تمام دوستوں خصوصاً ایاز احمد کی عقیدت و محبت اور گاہے بگاہے ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کے سلے میں اس وقت انہیں محض اپنا نذر ان عقیدت ہی پیش کر سکتا ہوں۔

## ملک راشد فیصل



## باب اول

## سوانح زگاری اور اس کافن

سوانح نگاری اس لحاظ سے دوسری اصناف نثر سے مختلف ہے کہ اس میں کسی ایک کردار سے متعلق تفصیلات کو حقیقی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کردار کے لیے شرط ہے کہ وہ حقیقی ہو اور کسی حد تک قدر و قیمت کا حامل بھی ہو۔ غیر معروف اور گمنام شخصیات کو عموماً سوانح نگاری کا موضوع نہیں بنایا جاتا۔ سوانح تاریخ سے کبیں وسیع چیز ہے جس میں تاریخ کی صفات مدغم ہو جاتی ہیں۔ حقائق کے بیان کے ساتھ اس میں اولی چاشنی اور حسن ترتیب کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ ہیرو کی طویل بلکھری ہوئی زندگی کے مختلف حالات و واقعات کو پر کھے اور حسن انتخاب کے ساتھ انھیں قارئین کے سامنے پیش کرے۔ سوانح نگاری اسی لیے ایک مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ عرفی کا یہ مصروف کسی بھی سوانح نگار کے لیے قابل توجہ ہے۔

‘ہشیار کہ رہ بردم تعی است قدم را’

اُردو سوانح نگاری انگریزی سوانح نگاری سے خاص متأثر ہوئی ہے اور اس کے موضوع و مادوں کو بہت حد تک اخذ بھی کیا ہے۔ سوانح نگاری پر مفصل بحث سے قبل ہم اس کی مختلف تعریفوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ آکسفورڈ کشنری میں بائیوگرافی کے معنی ہیں: ”کسی شخص کے ذریعے لکھی گئی کسی فرد کی زندگی کی کہانی“۔

ڈرائیڈن نے سب سے پہلے ۱۹۸۳ء میں افظع سوانح عمری کی تعریف اس طرح کی ہے۔

”یہ مخصوص افراد کی زندگیوں کی تاریخ ہے۔“

جانشن کے خیال میں ”سوانح عمری مختلف فتم کی ایسی بیانیہ تحریر ہے جسے بڑی رضامندی کے ساتھ پڑھا جائے اور بڑی آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد تک جس کی رسائی ہے۔“<sup>۱</sup> اس تعریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوانح لکھنے کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قارئین بڑی شخصیات کے مطالعے کے ذریعے اپنی زندگیوں کو مقابل عمل بنائیں۔ چنانچہ سوانح شخص انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغل زندگی اور وفات، کا بیان ہی نہیں بلکہ اس کی فرد کے ظاہر و باطن، عادات و اطوار، اخلاق و معاشرت، وراشت اور انسیاتی کیفیت اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کا مرکب بھی ہے۔ سوانح نگار کے لیے وہ تمام باتیں دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں جن سے شخصیت کی تعمیر کرنے اور ایک مکمل تصویر اخذ کرنے میں مدد ملتے۔ سوانح عمری کی جدید تعریف انھیں باتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

ہیرو کی زندگی واقعات، حادثات و مسائل سے پر ہوتی ہے اور ان میں سے ہر واقعہ اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے اور انھیں واقعات کی کڑیوں سے زندگی کا ایک انتقال تیار ہوتا ہے لیکن سوانح نگار کے لیے ہر واقعہ اہم نہیں۔ اسے تو واقعات کی بھیڑ سے ان اہم واقعات کا انتخاب کرنا ہے جو فرد کی زندگی پر روشنی ڈال سکیں۔ ظاہر ہے کہ ہیرو کی زندگی کے خدوخال نمایاں کر سکے لہذا سوانح نگار کے لیے واقعات کا انتخاب ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایک سوانح نگار کے لیے وہی واقعہ اہم ہوتا ہے جس سے ہیرو کے کردار پر روشنی پڑتی ہو جو اہم واقعہ غیر اہم کیوں نہ ہو۔ پولین کی زندگی میں عموماً اس کی فتوحات کو لوگ

۱۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۲ء تا ۱۹۷۵ء)، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۲۳۔

۲۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۲ء تا ۱۹۷۵ء)، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۲۴۔

اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے سوانح زگار کے لیے وہ چھوٹے چھوٹے اختلافات اہم ہیں جو پولین اور اس کے بھائی کے درمیان پیدا ہوئے۔ اسی طرح 'حیات جاوید' میں سر سید کا نوکر کو مارنا، کسی شخص کا گفتگو کرنا یا دوستوں سے بے تکلف باتیں زندگی کی حقیقوں کو آشکارا کر دیتی ہیں۔ سوانح عمری کو طوالت سے بچانے کے لیے Margins اپنی کتاب "Aspect of Biography" میں لکھتے ہیں:-

"سوانح عمری میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ جوں کا توں پیش کردیں اس طرح ہر شخص کی سوانح عمری اس کے ایام حیات کی طرح طویل ہو جائے گی۔"

لیکن اس سلسلے میں کسی کلیے کو پیش کرنا بھی مشکل ہے بلکہ واقعات کی نوعیت پر اس کا انحصار ہے۔ واقعات کی کائنٹ چھانٹ سے باظا ہر زندگی کا تسلسل ختم ہوتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ عدم تسلسل کے باوجود بھی واقعات کا سلسلہ ملتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے حسن تھوڑا اور حسن ترتیب شرط ہے۔ اکسفورد ڈاکشنری میں سوانح کو ادب کی شاخ قرار دیا گیا ہے یعنی سوانح میں ادبیت اور حسن ترتیب پر خاص طور سے بہت زور دیا گیا ہے۔ اسی سیاق میں ڈاکٹر عبدالقیوم اپنے مضمون "سوانح نگاری کیا ہے" میں رقم طراز ہیں:-

"نقاد ان فن سوانح میں صداقت اور سچائی پر بہت زور دیتے آئے ہیں لیکن محض صداقت اور خشک واقعات ہی سوانح میں دچپسی نہیں پیدا کر سکتے بلکہ اظہار بیان کی خوبی اور خوش اسلوبی کو بہت دخل ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے سوانح کو ادب کی ایک شاخ قرار دیا ہے اگرچہ اس میں شعوری طور پر ایک فرد کی زندگی کو مر بوط کیا جاتا ہے اس لیے اس شعور میں تاریخ سے مددی جاتی

ہے لیکن اس کی تخلیقی صفت اور دلچسپی پیدا کرنے کی ضرورت نے ادبی اصناف سے اس کا دامن باندھ دیا ہے اس لیے ایک سوانح میں تاریخ، فرد و اصدار ادبی چاشنی مینوں کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی حسن ترتیب اس کے حسن کا سبب ہن جاتی ہے۔<sup>۱</sup>

مذکورہ اقتباس سے تاریخ و سوانح کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابتدائی دور میں سوانح عمری اور تاریخ میں کوئی واضح فرق نہیں تھا بلکہ سوانح عمری کو تاریخ بھی کا ایک جز مانا جاتا تھا کیونکہ مؤرخ کی طرح سوانح نگار بھی واقعات و حادثات کی اصل حقیقت بیان کرتا ہے۔ جدید اصولوں کی روشنی میں سوانح عمری اور تاریخ میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ دونوں کے اس فرق کو ڈاکٹر سید شاہ علی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:-

”سوانح عمری کا موضوع ایک انسان ہے اور تاریخ کا ایک ملک۔ سوانح نگار کے لیے تجوم ثانوی اہمیت رکھتا ہے اور تاریخ کے لیے افراد، خواہ وہ کتنے بھی بڑے کیوں نہ ہوں ضمیمی حیثیت رکھتے ہیں۔ مؤرخ انسانوں کا ایک دور میں کے ذریعے اور سوانح نگار منفرد آدمیوں کا ایک خورد میں کے تحت مشابہ کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں سرکاری ایوانوں میں لے جاتی ہے، سوانح عمری بھی قیام گا ہوں میں۔ تاریخ میں ایک فائح کی سپاہیانہ صفات اہم ہوتی ہیں اور سوانح نگاری میں اسے بحیثیت انسان پیش کیا جاتا ہے۔<sup>۲</sup>“

سوانح نگاری میں موضوع بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کو موضوع کے انتخاب کے وقت دانشمندی، دیانت داری اور غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے۔ موضوع کے لحاظ سے سوانح نگاری کی دو تمیزیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک تو وہ

۱ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ (مرتب)۔ اردو نشر کا فنی ارتقا، دہلی ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۰

۲ ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء، ص ۳۹

سوانح جس کا ہیر و سوانح نگار کا کوئی ہم عصر ہو یا ایک ایسا شخص ہو جس کی زندگی سے متعلق اہم معاملات کے بارے میں وہ براہ راست معلومات حاصل کرنے کا اہل ہو۔ ایسی صورت میں سوانح نگار اپنے ذاتی ربط، ہم عصر لوگوں کے تاثرات، حالات کی ضروری تفصیلات کے بارے میں علم اور اپنے موضوع کے ذہنی و سماجی پس منظر سے واقفیت کی بنا پر ایک ایسا مرقع تیار کر سکتا ہے جو اس کے بھروسے کی سیرت کو بھر پور طور پر پیش کر سکے اور اس کے کردار کے پہاڑ گوشوں کو جاگر کر کے اور نمایاں پہاڑوں سے انھیں ہم رشتہ کر کے ایک نئی بصیرت پیدا کر سکے۔

موضوع کے اعتبار سے سوانح نگاری کی دوسری قسم وہ ہے جس کا ہیر و کوئی ایسا فرد ہے جس سے سوانح نگار زمانے کے لحاظ سے کوئی قربت نہیں رکھتا۔ ایسی سوانح کے لیے سوانح نگار کو اپنا مواد حاصل کرنے کے لیے بڑی چھان بین کرنی پڑتی ہے۔ اس کو تاریخ، وقائع، خطوط، یادداشتوں، ڈائریوں اور اس عبد کے دوسرے افراد کی سوانحوں سے اپنے لیے معلومات حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بھی بھی ان معلومات میں کہیں کہیں خلا رہ جاتا ہے جس کو پر کرنے کے لیے سوانح نگار کو اپنے منطقی استدلال، تجھیل یا قیاس سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔

موضوع کے انتہا ایک بڑا مسئلہ سوانح نگار کے نظریات کا ہیر و کے نظریات سے مطابقت کا ہونا ہے۔ عموماً سوانح نگار ایسی شخصیات کا انتخاب کرتا ہے جن کے نظریات اس کے مزاج کے موافق اور ہم آہنگ ہوں۔ نظریات کے نکراوے کی صورت میں ہیر و کے محاسن بھی معاہب میں بدل جاتے ہیں مزید یہ کہ سوانح کا حسن زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سوانح نگار کی ہیر و سے ذہنی مطابقت ضروری ہے۔

سوانح نگار کو قلم کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر غیر جانبداری کا غصر پیدا ہونا مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ سوانح نگار کی اپنے موضوع سے دلچسپی و ہمدردی بھی ضروری ہے لیکن خلوص و ہمدردی کا مطلب جانبداری یا قصیدہ خوانی نہیں بلکہ ہیر و کے کردار اور اس کی شخصیت کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنا ہے۔

موضوع کے انتخاب کے بعد سوانح نگار کے لیے سب سے بڑا مسئلہ مواد کی

فراتمی کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اسے بے حد کا وشیں کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے لیے اسے مختلف مآخذ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک ذریعہ خود ہیرو کی اپنی تحریریں ہیں جنہیں خود نوشت مواد کہا جاتا ہے مثلاً رورنا مجھے، یادداشیں، خطوط اور دیگر اصناف۔ دوسرا ذریعہ خود اس کی اپنی ذات ہے یعنی اس کی گفتار و کردار، اقوال و اعمال، اطائف و ظرافت وغیرہ۔ تیسرا ذریعہ اس کے دوست احباب، معاصر، اخبار و رسائل اور سوانح نگار کی ذاتی اور عام معلومات ہیں۔

سوانح کے مواد میں سب سے زیادہ اہمیت خود نوشت کو حاصل ہے۔ چونکہ ہیرو اس کے ذریعے خود اپنے بارے میں حقائق و کوئی اتفاق کا اظہار کرتا ہے اور اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے اس لیے اس کی صحت کے سلسلے میں زیادہ شک و شبہات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ برادر است اور بلا واسطہ ذریعہ ہوتا ہے اور دوسرے ذرائع سے جو مواد حاصل ہوتا ہے وہ لا زمی طور پر اس سے متاثر ہوتا ہے نیز یہ کہ اس میں حقائق کو شعوری یا غیر شعوری طور پر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہو گا کہ ہیرو بھی غلط بیانی کر سکتا ہے لیکن ایسا اس کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ انگریزی سوانح نگاری میں باسول نے خود نوشت اور ہیرو کے ذریعے حاصل کردہ مواد سے خوب استفادہ کیا۔ اس سے قبل بھی چند سوانح نگاروں نے اس طریقے کو برداشتھا جن میں قابل ذکر والئن اور میں ہیں۔ اسی لیے والئن پہلا شعوری اور فنی سوانح نگار سمجھا جاتا ہے۔ باسول نے جانس کی سوانح لکھ کر انگریزی ادب میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔ اس کی تالیف سے فن سوانح میں ایک نئے انداز کی ابتداء ہوئی۔ اس نے سوانح کے تمام اجزاء کو ایک وحدت میں پروردیا جو اس سے پہلے انگریزی ادب میں معصوم تھا۔ اس نے ہر واقعے کو خود بولنے کی اجازت دی ہے اور کسی واقعے کو اپنے ذاتی تاثرات سے آلو دہ نہیں ہونے دیا۔ مگر اردو سوانح عمریوں میں عقیدت اور ذاتی تاثرات نے فنی خوبیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اس خامی کا شکار مولا نا حالی بھی ہیں اور مولا نا شکلی بھی۔ سید سلیمان ندوی نے تو ذاتی خیالات کو حقائق پر ترجیح دی ہے۔

مواد کے حصول وغیر حصول کے سلسلے میں سید شاہ علی نے سوانح عمریوں کو

مختلف خانوں میں بائیت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”یہ صحیح ہے کہ بعض ایسی سوانح عمریاں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سوانح نگاروں کو مواد کے بجائے صرف اپنی صناعی پر محروم سا کرنا پڑتا ہے مثلاً حالی کی حیات سعدی، انگریزی میں کارلائل کی حیات اسٹرلنگ، ایٹ کی حیات جان گلی (Gilly) اور پامرکی حیات الائس فریمن یا مر۔ ایسی سوانح عمریاں بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اس قسم کے دستاویزات کی ادبی خوبی میں سوانح نگار کی صناعی نے چار چاند لگا دیے ہیں مثلاً یادگار غالب۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن کے لیے اس قسم کا مواد حاصل کرنے میں سوانح نگار کو غیر معمولی دوز دھوپ کرنی پڑی ہے مثلاً باسول کی حیات جانس اور ایسی بھی جن کی تصنیف میں ایسی محنت نہیں کرنی پڑی اور بنابنایا مواد مل گیا مثلاً لاک ہارت کی حیات اسکاٹ لے۔“

روز نامچوں اور یادداشتوں کے ذریعے مواد کی مناسب ترتیب و تہذیب میں بھی مدد ملتی ہے لیکن ہر ہیر و اپنا روز نامچہ نہیں رکھتا خصوصاً مشرقی ممالک میں روز نامچے اور یادداشتیں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی اور جتنا بھی میسر ہو اس سے واقعات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

سوانح نگاری کے لیے مواد کے طور پر خطوط مشرق و مغرب میں یکساں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ خطوط بجائے خود ادب کی قدیم ترین شکلوں میں سے ہیں لیکن ان کا تعلق شخصیت سے جڑا ہوتا ہے اس لیے انھیں سوانح عمریوں میں حسب ضرورت استعمال کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بہت پہلے سے ان کا استعمال تھا۔ والٹن، ملسمین، باسول وغیرہ بھی ان سے مستفید ہوئے ہیں۔ اردو ادب میں حالی نے یادگار غالب اور حیات جاوید لکھتے ہوئے خطوط سے مواد حاصل کیا۔ بعض ایسے مسائل جو کسی

اور کے ذریعے سے حل نہیں ہو سکے حالی نے خطوط کی مدد سے انھیں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کے خطوط دراصل اپنے دور کی تہذیب، ثقافتی، سیاسی و سماجی حالات کے عکاس ہیں۔ چنانچہ ان کے سوانح نگار کو موضوع اور عہد صحبت کے لیے ان سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ اس کے باوجود خطوط سے استفادہ کرتے ہوئے بھی سوانح نگار کو احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ کبھی کبھی خطوط باعثت سوانح عمریوں کے ادبی و صرف کو بڑھانے میں مانع ہوتے ہیں۔ خطوط کا صحیح اور منصفانہ استعمال سوانح نگار کی قابلیت پر منحصر ہے۔ سوانح نگار کو ایسے خطوط کا انتخاب کرنا چاہیے جو بالواسطہ موضوع کی شخصیت پر روشنی دالتے ہوں۔ خطوط کے فنی استعمال میں تخلیقی تخلیل سے کام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ مرور ایام کے ساتھ انسان میں انسانی تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔

مذکورہ بالا روزناموں، یادداشتوں اور خطوط وغیرہ کے علاوہ ہیرو کی مختلف تحریریں، تقریریں اور تفہیفات بھی اس کی سوانح حیات کے لیے مواد فراہم کر سکتی ہیں۔ اگر اول الذکر چیزیں ہیرو کی دلی کیفیات کی آئینہ دار ہوتی ہیں تو مؤخر الذکر چیزیں فکری و فنی صلاحیتوں کو روشن کرتی ہیں۔ لہذا سوانح نگار کو بہت بچوں کے پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

سوانح نگار کے لیے ہیرو کے اقوال (ملفوظات) و اعمال، اطائف و نظرائف اور مصنفوں کی ذاتی معلومات بھی سوانح کی ترتیب میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ معلومات کی فراہمی کے لیے ہیرو کے خاندان کے دیگر افراد سے مددی جا سکتی ہے۔ ملفوظات کو صحت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں فوراً قلم بند کر لیا جائے۔ اس عمل میں بھی حسن انتخاب کا سلیقہ ہونا چاہیے۔

ہم عصر افراد اور اخبارات و رسائل کے تراشے ہیرو کے لیے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ لہذا سوانح نگاری کے لیے معاصرین کی شہادتوں کے ساتھ اخبارات و رسائل کی فراہمی بھی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ عموماً سوانح نگار کو اپنے ہیرو سے عقیدتی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس سے عداوت بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے سوانح نگار کم ملیں گے جن میں ان دونوں میں سے کوئی بات نہ ہو۔ ایسی حالت میں معاصر تاثرات بہت

مفید ثابت ہوتے ہیں اور ہیرو کے متعلق ایک صحیح اور صحت مند تصور قائم کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے سوانح عمریاں کس قدر ممتاز ہوتی ہیں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:-

”سوانح میں اپنے دور کی تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی کشکش کا اظہار ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کوئی سوانح مکمل نہیں ہو سکتی کیوں کہ ہیرو جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کے اثرات اس کی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں۔ اس لیے اُسی فرد کی سیرت اور ذہنی ارتقاء کے بغیر اس دور کی تمدنی زندگی کو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن یہاں بھی وہی با تین بیان کرنی چاہیے جو ہیرو کی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتی ہوں۔ تاریخی و سماجی پس منظر اس حد تک ہونا چاہیے کہ ہیرو کے کردار پر روشنی پڑ سکے۔ محض تمدنی زندگی کی آمینہ داری یا گرافر کا موضوع نہیں ہوتی۔ ایک اچھی سوانح میں یہ پس منظر اس طرح ملا جانا نظر آنا چاہیے کہ تو شخصیت اس میں چھپ کر رہ جائے اور نہ محض شخصیت ہی کا غلبہ رہے ۔“<sup>۱</sup>

بہر حال معاصرانہ معلومات ایسی قیمتی اور مفید ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کرنا ہر حالت میں نامناسب ہے۔ پیدائش سے موت تک مختلف افراد ہیرو کی شخصیت کے ارتقاء کے شاہد ہوتے ہیں جن میں بعض کا تعلق اور ان کی معلومات گہری ہوتی ہیں۔ وہ اس کے کردار کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہوتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کی شہادتیں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ہیرو سے متعلق اس کے دوست احباب اور معاصرین کا تحریری یا تقریری اظہار خیال خواہ وہ گفتگو کی شکل میں ہو یا تقاریر کی، خطوط کی یا روزنامچوں کی، مصائب کی یا نظموں کی، ایسا ہی اہم ہے جیسا ہیرو کی اپنی تحریر و تقریر۔ سوانح نگار کی ذاتی معلومات پر بھی یہی چیز صادق آتی ہے۔ سوانح نگار کو خود

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ اردو نشر کا قسمی ارتقاء، دہلی۔ ۱۹۹۲ء ص ۲۲-۳۲

پر پورا اعتماد ہوتا ہے اور وہ اپنے تعلقات، مشاہدات و تجربات سے بھر پور فائدہ اٹھاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ سوانح نگار کو کبھی ہیر و کی زندگی میں اس کی سوانح عمری لکھنے کا خیال نہ آیا ہو یا ہیر و کی زندگی کے ابتدائی، درمیانی یا آخری دور سے اسے نیاز حاصل نہ رہا ہو یا اس کی زندگی کے بعض مدارج یا مظاہر سے وہ ناواقف رہا ہو۔ ایسی صورت میں اسے لامحالہ ہیر و اور ویگر ذرائع سے حاصل کردہ مواد پر تکمیل کرنا پڑے گا۔

سوانح نگاری کے فن سے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے کون کون سی چیزیں نقصان وہ ثابت ہو سکتی ہیں یا سوانح نگار کو سوانح لکھتے ہوئے کن طریقوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر سید شاہ علی نے اپنی کتاب "اردو میں سوانح نگاری" میں بھر پور بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:-

"سوانح نگاری انسان کے اخلاقی، تاریخی یا سائنسی تجسس سے آزاد ہے۔ ان غلطیم مغادرات کو اس سے ضمنی مدل سکتی ہے لیکن یہ اس کے مقاصد میں شامل نہیں ہے،"

آگے چل کر وہ اخلاقی طریقہ کے تحت لکھتے ہیں:-

"اخلاقیات سے اس کا تعلق تین طرح کا ہو سکتا ہے جو نقاط ہے اور اس کے اصل مقصد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اول یہ کہ وہ کسی اخلاقی نظریے کی تائید کے لیے استعمال کی جائے یا اس کے ذریعے اچھے اخلاق کی اشاعت کی کوشش کی جائے۔ دوم یہ کہ بد اخلاقی پر پرده ڈالنے کی سعی کی جائے۔ سوم یہ کہ ذاتی تعلقات کی بنابر کسی کی مدح یا ندمت کی جائے۔ یہ سب سچائی اور صاف گوئی کی، جو سوانح نگاری کا اصل اصول ہے، خلاف ورزی کرتے ہیں۔"

۱) ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، گراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۳۰

ہر اصل سوانح نگاری کا مقصد ہیروگی ہو بہو اتصویر کھینچنا ہوتا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں اس کی پوری زندگی نقش ہو جائے۔ اسے موافق اور مخالف دوں چیزوں کو ایک نظر سے دیکھنا ہوتا ہے۔ سوانح نگار واقعہ نگار ہوتا ہے اور صاف گولی اور سچائی اس کی تحریر کے اہم عناصر ہیں۔ اسے ہیروگی زندگی کے روشن اور تاریک پیلوؤں سے محبت نہیں بلکہ اس کا کام غیر جانبدارانہ اور سچی مرقع کشی ہے۔ چنانچہ اخلاقی تبلیغ سے سوانح نگاری بالکل بے نیاز ہے۔ سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ ہیروگی خوبیوں اور خرابیوں، نیکیوں اور بدیوں سب کو بیان کرے اور ان چیزوں کے اخذ و ترک کو قاری کے اوپر چھوڑ دے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہیں اور ان کے عیوب کو بیان کرنے سے یہ مقصد رکھا جاتا ہے لہذا ان کا اظہار خصوصاً ان کی موت کے بعد نامناسب ہے۔ لیکن یہ استدلال کرتے ہوئے اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ انسان کی عظمت اس کی بشریت ہی میں ہے نہ کہ فوق البشریت میں۔ انسان کی کمزوریاں ہی اس کی قوت ارادی کو قابل تقلید بناتی ہیں۔ اسی طرح رہنمائی کرتے ہوئے ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین سوانح نگار کو مشورہ دیتے ہیں:-

”حیات نگار کو اپنے موضوع کی کمزوریوں کا محل کر اعتراف کر لینا چاہیے ورنہ یہ زبردست اخلاقی گراوت بھی جائے گی جو اس شخص کے مرنے کے بعد بلا سبب حیات نگار نے اپنے سر لے لی ہے۔ بزرگوں کی خطاؤں میں بدایت بھی ہوتی ہے تاکہ نئے آنے والے ان پامال را ہوں سے بچ کر چلیں۔ بزرگ فوق البشر تو نہیں ہوتے جبکہ یہ ذہنیت انھیں فوق البشریت کے مرتبے پر فائز کر دیتی ہے، جن کی ہر بات، جن کا ہر قول وحی و الہام خبر ایا جاتا ہے۔“

اسی طرح ڈاکٹر سید شاہ علی سوانح نگار کو کچھ قیمتی مشورے دیتے ہیں، جو سوانح

کے فن کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں:-

”سوخ نگار کو وقتِ نظری، صبر، محنت، تحقیق، ترمیم و انتخاب کی اہلیت اور انتہائی صحبت کا جو رکھ رکھا و اور جذب اتنیتیت یا رومانسیت سے خالی ہو، مالک ہونا چاہیے۔ اسے ترازو کے پلڑے متوازی رکھنے چاہیے۔ ماضی و مستقبل پر نظر رکھنی چاہیے اور وقتی جماعتی تکدر سے کام بند کر لینے چاہیے۔ اسے ان منصوفات اور فیاضانہ اصولوں پر کام بند رہنا چاہیے جو ایک ناقد دوست کے فیصلے کو متحرک کرتے ہیں۔“

سوخ نگار کو تاریخی طریقہ اپنانے سے بھی پہیز کرنا چاہیے یعنی حقائق کو نشک انداز میں بیان کرنا تاریخ کا کام ہے، سوخ کا نہیں۔ سوخ اور تاریخ کا فرق واضح کیا جا چکا ہے۔ زمانہ قدیم میں سوخ نگاری تاریخ کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی۔ چین میں سوخ عمری کو تاریخ سے الگ اور آزاد تصور کیا جاتا تھا لیکن یہ بحث دیگر ممالک میں اتنی واضح نہیں ہے۔ عرب اور ایران میں سوخ عمری کا تاریخ سے بالکل جدا گانہ تصور نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ شبی بھی جوارہ و سوخ نگاروں میں علوم اسلامی سے زیادہ متاثر ہیں، اپنی اصناف میں سوخ عمری اور تاریخ کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یورپ میں بھی ایک زمانے تک سوخ عمری کا شمار تاریخ کے تحت کیا جاتا تھا۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سوخ اور تاریخ میں جہاں کچھ موافق اور یکسانیت ہے وہیں امتیازات و اختلافات بھی ہیں۔ دونوں کے موضوعات و مقاصد جدا گانہ ہیں۔ سوخ اور تاریخ کے فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقیوم اپنے مضمون ”سوخ نگاری کیا ہے؟“ میں رقم طراز ہیں:-

”سوخ میں ایسے واقعات اور حالات ظاہر ہونے چاہیے جن میں آپس میں مطابقت اور تعلق اور جو ہمارے ذہنی اور دماغی رجحانات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکیں۔ سوخ میں اس شخصی

رشتے کی کارفرمائی ایک امتیازی بات ہے اور سوانح کوتارخ سے یہی رشتہ علیحدہ کرتا ہے۔ یہ تعلق سوانح میں ایک جگہ مجتمع ہو جاتا ہے مگر تاریخ میں باقی نہیں رہتا۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ سوانح مصنف کی دماغی ساخت کا نتیجہ ہوتی ہے مگر اس کے ماحول اور سماجی حالات سے متاثر بھی ہوتی ہے ॥

ڈاکٹر سید شاہ علی نے سامنی طریقے کے تحت انسان کے موروثی حالات اور اس کا شجرہ نسب، انسان کے موروثی اور اکتسابی اوصاف کا تجزیہ، اس تجزیے کی ضرورت اور اس کا امکان، علم نفیات اور فن سوانح نگاری کا باہمی تعلق وغیرہ جیسے مسائل کا ذکر کیا ہے اور اس طریقے کو سوانح نگاری کے لیے غلط قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک نسبی تفصیلات کا کسی سوانح عمری کی عمدگی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے سوانح نگاری کا بہترین نمونہ باسول کی حیات جانس م موجود ہے جو بغیر ہیر و کی نسبی تفصیلات کے جائزے کے کامیاب ہے اور ایک اور سوانحی شاہ کار لاک بارٹ کی "چیات اسکاٹ" ہے جسے ان تفصیلات سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ غصر حاضر کی سوانح نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر سید شاہ علی کا مانتا ہے کہ:-

"موجود حالات میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ گو خاندان اور احباب موضوع کا ایک حصہ بلکہ اکثر ایک بڑا حصہ ہوتے ہیں لیکن یہ ہیر و ہی کی شخصیت ہے جو مرکزی اور اہم ہے۔ تم ظریغی تو یہ ہے کہ اس وقت بھی جب کہ ہیر و ایک الگ تحلیل زندگی بسر کرتا ہے اس کے دوست احباب کے ذکر کو ٹھوںس دیا جاتا ہے اور خاندان کے معاملے میں تو مناسبت کے اصولوں کو بے طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور اسلاف کے متعلق یہ روایتی پہلا باب سخت الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ سوانح موقوعوں کے موروثی اثرات کے بارے میں اس قسم کی تحقیقات چاہے وہ

پہلی پشت تک ہی کیوں نہ ہو سوانح زگار کے لیے اکثر ایک دام  
مزدوری ثابت ہوتی ہیں۔ گوسائنسی فقط نظر سے یہ اہم ہو لیکن  
اصول اتحاد اسے اصل سوانح عمری سے خارج کر دے گا۔ بے  
حد ضروری تسلیم اتفاقیات کے علاوہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ ایک  
شنبیے کی شکل میں ہاتھ کیا جا سکتا ہے۔<sup>۱</sup>

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہیرو سے متعلق جزئیات اور جنی وہ اتنی  
حالت کو سوانح میں جگہ دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ جزئیات کی بھی کئی فرمیں کی جا سکتی  
ہیں مثلاً اہم اور غیر اہم، بھی اور غمودی وغیرہ۔ ان کے انتخاب کے سلسلے میں بھی مختلف  
راہیں دی جاتی ہیں مثلاً بعض کا خیال ہے کہ صرف نمایاں خصوصیات لی جانی چاہیں۔  
جانسن کا خیال ہے کہ جزئیات کو متنانت کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ اس کا قول ہے کہ  
”ان واقعات پر جو محض مادی عظمت یا اثر و اقتدار کا باعث  
ہوتے ہیں سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر جانا اور خیالات کو تجھی  
کو اکف میں لے جانا اور زندگی کی باریک جزئیات کو نمایاں کرنا  
ہی فن کاری ہے۔“<sup>۲</sup>

سوانح عمری کی تالیف میں خطوط اور یادداشتوں سے واضح تفصیلات کو اخذ  
کرنا قارئین کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ قارئی کو عام حالات پڑھتے  
پڑھتے ہیرو کی کوئی ذاتی دلچسپ چیز مل جاتی ہے تو اس کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور  
اس کے اپنے اثرات قائم ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو بے کار مواد میں نہیں  
شامل کرنا چاہیے۔ ہر چیز جو ہیرو کی گفتگو، رنگ ڈھنگ، آواز، طریقہ اظہار، حرکات و  
سکنات وغیرہ سے متعلق ہو، مفید اور اہم ہے۔ ہر وہ چیز جو ہیرو سے مخصوص ہے اس کی  
سوانح عمری میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔ اس طرح کی ذاتی اور انفرادی خصوصیات

۱۔ ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۳۲-۳۳

۲۔ ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۳۵

کے ذریعے سوانح نگار ہیرو کی ایک زندہ تصویر پیش کرتا ہے جو موئخ کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ یہی طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے سوانح نگاری شخصیت کو سچائی اور دانائی کے ساتھ پیش کر سکتی ہے اور کسی جو ہر قابل کی دلی کیفیات اور معاف و محاکم پر نظر ڈالنے کا موقع فراہم کرتی ہے نیز یہ پامدار عظمت کے لیے محنت، جغاکشی، اخلاقی اوصاف اور خداود صلاحیتوں کی ضرورت کو بھی واضح کرتی ہے۔ یہی چیزوں میں جن کی وجہ سے سوانح نگاری تمام اصناف ادب میں سب سے زیادہ سبق آموز اور دلچسپ قرار دی جاتی ہے۔

سوانح عمری طویل بھی ہو سکتی ہے اور مختصر بھی۔ طویل سوانح عمری میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی گفتگی یا تحریر نہ رہ جائے۔ مختصر سوانح عمری میں مختلف مسائل پر طبع آزمائی کی گنجائش نہیں ہوتی حالانکہ دونوں قسم کی سوانح عمریاں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت کی حامل ہیں۔ استفسن اور پیوٹارک کا ماننا ہے کہ طوالت اور ہیرو پرستی موضوع سے قربت یا عقیدت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوانح عمری کی طوالت و اختصار کا فیصلہ دستیاب شدہ مواد کی جملہ مقدار، موضوع کی اہمیت اور دستاویزی شہادت کی حقیقی قدر و قیمت کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ اس فیصلے میں حیات، کردار کا تنوع اور شخصیت کے مختلف پہلو بھی اہم رول ادا کرتے ہیں مثلاً سر سید کی سی مختلف انواع شخصیت کے گوناگون پہلو سوانح نگار کو مختلف چیزوں کے جائزے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں پر سوانح نگار کی سمجھ بوجھ اور ترک و انتخاب کی صلاحیت بڑی معنی خیز ثابت ہوتی ہے۔ انتخاب میں ہیرو کی شخصیت کو مد نظر رکھنا ہوتا ہے کہ کہیں کوئی غیر ضروری چیز نہ شامل ہو جائے یا ایسی ضروری چیز نہ رہ جائے جس سے شخصیت پر روشنی پڑتی ہو۔ ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین لکھتے ہیں:-

”تاہم حالات کی اس تراش خراش اور کانٹ چھانٹ میں بڑی احتیاط درکار ہے۔ معمولات کا اعادہ محض بریکار ہوگا۔ یہ معمولات اس کے شخصی بھی ہو سکتے ہیں اور وہ بھی جو انسانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو شامل کر کے تحریر کو بوجھل نہ کرنا، ہی بہتر

ہے۔ ان واقعات کو چھانٹ لینا چاہیے جن کی تطبیق دوسرے حالات سے اور پہندہ در پہندہ روایات سے ہوتی ہو۔ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہیے۔ ذاتی معاہب و محاسن کو بے کم و کاست بیان کر دینا ناگزیر ہے۔ اگر ایسا کرنے کی جرأت نہ ہو تو جانس کے بقول موضوع کو چھوٹا ہی نہ چاہیے۔ حیات نگار میں اخلاقی جرأت کمال درجے کی ہونی چاہیے ورنہ وہ اپنے موضوع سے انصاف نہ کر سکے گا۔ اپنی تحقیق و جستجو کے دوران اسے جو کچھ معلومات حاصل ہوں ویا نت و صاف گوئی سے بیان کرنا چاہیے۔<sup>۱</sup>

جدید سوانح نگار لش اسٹریچی تفصیلات کی موافقت نہیں کرتا۔ وہ بھارتی پہنچ کم، مذصل اور مستند سوانح عمریوں کا مقابلہ ہے جن میں بغیر کسی انتخاب اور مرکزی تخلیل کے صاحب تذکرہ کے متعلق واقعات کا ایک انبار جمع کر دیا جاتا ہے جس سے نہ پڑھنے والے کو دلچسپی ہو سکتی ہے اور نہ شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ فتن سوانح نگاری کے لوازم میں سب سے اہم غضر سوانح نگار کی شخصیت ہے۔ ایمرسن کا کہنا ہے کہ ایک عظیم آدمی کی ضرورت ہے تا کہ ایک عظیم تر آدمی کی تشریع کر سکے۔ عظمت کے علاوہ یہ شرط بھی لگائی جاتی ہے کہ سوانح نگار کو ہیرود کے گرد و پیش کے حالات سے، اس کے مناقشات سے اور اس کے اوصاف و کمال سے آگئی ہو اور انہی چیزوں میں مہارت اور دلچسپی ہو جن سے ہیرود کو تخصیص ہو۔ مگر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو ان شرائط کو پورا نہیں کرتیں۔ پھر بھی عمدگی کے معیار پر پہنچتی ہیں۔ باسول اور جانس میں عظمت کے لحاظ سے کوئی مناسبت نہیں ہے اور حیات جانس دنیا کی بہترین سوانح نگاری قرار دی جاتی ہے۔ امیراللہ خان شاہین کا خیال ہے کہ:-

”حیات نگار کی شخصیت موضوع کی شخصیت سے عظیم ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ گو عام امکان میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لکھنے والا قلم ہی

۱۔ ذاکر امیراللہ خان شاہین۔ فتن سوانح نگاری اور دیگر مضامین، دہلی ۳۷۹۷ء، ص ۲۳-۲۲۲۔

اس وقت ہاتھ میں لیتا ہے جب موضوع کے کارنامہ ہائے حیات، زندگی کے اعمال و افکار اور سیرت و کردار کی بلندی و پختگی اسے اپنا گرویدہ بنالیتی ہے ورنہ پیشہ و رانہ سوانح عمریاں عرضی نویس اور محرر کی تحریر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔<sup>۱</sup>

حقیقت یہ ہے کہ سوانح نگاری کے لیے سوانح نگاری کی عملت کی صرف اسی حد تک ضرورت ہے جہاں تک فن سوانح نگاری کو مقصود و مطلوب ہو۔ زیادہ عملی بات یہ ہوئی کہ صحیح بیرون کا انتخاب کیا جائے اور اس کی داستان حیات کو مناسب طور پر یعنی صحبت، صاف گوئی، ہمدردی اور اختصار کے ساتھ سرا نجام دیا جائے۔ اس کے لیے سوانح نگار کو دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس میں قلمی یا مطبوعہ کاغذات سے حقائق کی چھان بین اور اس کے ماحصل کی ترجیحی کی بصیرت و صلاحیت اور اپنی معلومات کے نتیجے کو خوبصورت شکل دینے کی قابلیت ہوئی چاہئے۔ سوانح نگار کو محض خارجی افعال کی وقائع نگاری کے بجائے اندرونی فطرت کی مرقع کشی پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ اسے بیرون کے افعال اور اس کی اصلیت و حقیقت کے درمیان رشتہ کو بھی واضح کرنا چاہئے۔ سوانح عمری سوانح نگار کے تصور کی اسی طرح نمائندگی کرتی ہے جس طرح ایک شبیہہ نمائندگی کرتی ہے اس تصور کی جو فن کار کو اپنے موضوع میں نظر آتا ہے۔ دراصل یہ سوانح نگار کی ذات ہی ہے جو اپنی تشریح سے سوانح عمری کو زندگی بخشتی ہے اور یہ سوانح نگار کے فن کا اعیاز ہی ہے جو اسے ایک دلاؤیز شکل عطا کرتا ہے۔

سوانح نگاری ایک ڈنی فن ہے لہذا اس کی ترتیب میں سوانح نگار کو جذبات سے بالکل کام نہیں لینا چاہئے۔ جب کوئی بھی جذبہ ذہن پراشر انداز ہوتا ہے تو وہ جذبہ چاہے احترام کی شکل میں ہو یا شفقت کی، اخلاقی خواہشات کی یا مدد ہی ایقان کی، سوانح نگاری کو ختم کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:-

”فُنِّي اعتبار سے یک رخی اور یک طرفہ سوانح پامداحی خواہ وہ کتنی ہی مدلل اور مر بوط کیوں نہ ہو، بے جان سوانح ہے۔ عقیدت

<sup>۱</sup> ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہزاد۔ فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین، دہلی ۱۹۳۷ء، ص۔ ۱۳۱

مندی، فنی انتہار سے سوانح کے لیے سب سے زیادہ مبلىک چیز ہے۔ اگرچہ عقیدت کے اس جذبے میں عزت و احترام کا جذبہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے لیکن احترام کے یہ معنی نہیں کہ حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں ।“

اس طور پر سوانح نگار کو ہیر و کے تین غیر جانبدار اور بے باک ہونا چاہیے لیکن انسانی ذہنیت کا اتنا ضاء ہے کہ وہ موضوع کے انتخاب کے وقت اس کے ساتھ خود کے مذاق کی ہم آہنگی کا بھی خیال رکھنا چاہتا ہے چنانچہ موضوع کے ساتھ اس کی عقیدت، ہمدردی، اس کی طرف جوہ کا وہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ درحقیقت سیرت نگار اپنے خیال میں صداقت اور حقیقت سے کام لیتا ہے لیکن ہم ایک ہی شخصیت کے دوسرا نگاروں میں بڑا اختلاف دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی ہمدردی، چھان میں اور شلوغ کے اظہار میں کوئی کسر نہیں چھوڑ دی ہے۔ دونوں نے اپنے خیال میں حقیقت کو پیش کیا ہے اور صداقت دونوں کے پیش انظر ہی ہے لیکن شدید اختلاف بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ سید احتشام حسین اس کی وجہ پر کچھ یوں اظہار رائے کرتے ہیں:-

”ہر شخص کی زندگی میں ایک مرکز ہوتا ہے، ایک شاہراہ ہوتی ہے اور باوجود شخصیت کے مختلف مظاہر کے وہ ایک ہی شخص رہتا ہے۔ سیرت نگار اس عنصر کو تلاش کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ہیر و کا دل ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ کسی کے دل کا پانا زندگی میں دشوار ہے اور ہر نے کے بعد تو اکثر اور دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کبھی کبھی سیرت نگار جھنجھلا کر اس فرد کی تصویر اپنے آئینے میں دیکھنے لگتا ہے اور نتیجہ میں ہمیں اچھی کتاب مل جائے تو مل جائے لیکن اچھی سیرت یا سوانح عمری مشکل سے ملتی ہے ॥“

فن سوانح نگاری میں موضوع اور مواد کے بعد اسلوب یا طرز نگارش کو بنیادی

۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ (مرتب) اردو نشر کافتی ارتقا، دہلی ۱۹۹۱ء، جس ۳۲۴

۲) احتشام حسین۔ تنقیدی جائزے، لکھنؤ ۱۹۵۶ء ص ۳۷۲۔ ۳۷۳

اہمیت حاصل ہے۔ دوسری اصناف ادب کی طرح سوانح کا بھی اپنا ایک اسلوب ہے۔ اسلوب میں خود شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے اور سوانح نگار کی ذات و صلاحیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ مواد کی فراہمی کے بعد اس کو سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل فن ہے۔ بڑی سے بڑی شخصیت و افرمودا کے باوجود سوانح نگار کی کوتاہ قلمی یا طرز ادا کی بد سلایقی کی بناء پر مجرور ہو سکتی ہے۔

سوانح نگاری کا اسلوب تاریخ اور ناول سے مختلف ہے۔ اس میں نہ تاریخی خلائق کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناول و درامے کی طرح تخيلاً و حیاتی رنگ کی یعنی تحریر پر خیل کا گمان نہ ہو۔ حقیقتیں تصور میں گم نہ ہو جائیں۔ اسلوب میں اندھی عقیدت کی موجودگی سوانح نگاری کے لیے تم قاتل ہے۔ قارئی کو اس سے جانبداری کا احساس بھی نہیں ہونا چاہیے۔ سوانح نگار کے قلم میں تازگی و شگفتہ بیانی ہوئی ہوئی چاہیے۔ اردو میں شبلی کی سوانح نگاری کا خاص و صفت ان کا اسلوب ہی ہے جس کے ذریعے وہ دوسرے نقائص فن کو مات دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلوب جہاں شگفتہ و شاداب ہو وہیں حفظ مراتب کا پورا پورا خیال لیئے ہوئے ہو۔ ایسا محسوس نہ ہو کہ اسلوب کے بل پر شخصیت کو ابھارا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہیرو اور سوانح نگار دونوں کی شخصیتیں مجرور ہوں گیں۔ دراصل اسلوب میں ادب کی ضرورت ہے اور شخصیت کے مقام و منزلت کا شعور بھی۔

اسٹریچی کے نزدیک ادبیت کو فوقيت حاصل ہے۔ ناول اور سوانح میں فرق یہ ہے کہ ناول کے کردار فرضی اور سوانح کے حقیقی ہوتے ہیں۔ مشہور فرانسیسی سوانح نگار آندرے سوروانے اپنی ابتدائی سوانح عمریوں میں رومانی فضا پیدا کی لیکن اس کے بیہاں یہ فرق نہیں ملحوظ رکھا گیا کہ ایک سوانح کو تاریخی ناول نہیں ہونا چاہیے۔ اسٹریچی کا دیباچہ جدید سوانح نگاری کا منشور ہے جس میں اس نے ایجاز و اختصار، حسن انتخاب، آزادی خیال، اظہار حقیقت، غیر جانبداری، بے تعصی اور متعلقہ واقعات کی ترتیب

مناسب اور غیر جذبائی انداز کے ساتھ پیش کرنے پر زور دیا ہے۔

ناؤل نگار کے متعلق ناؤل اور سوانح عمری کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:-

”ناؤل نگاروں کی کامیابی کا راز بے الگام تصور پر قائم ہے۔ وہ ہر چیز پر کردار کی تخلیق کر سکتا ہے لیکن یہ کردار اس کردار کے مقابلے میں زیادہ چیز نہیں ہو سکتا ہے جو اسے بنانا چاہتا ہے۔“<sup>۱</sup>

یہ تخلیل کی پرواہ بھی ہے جس کی بنابر ناؤل اپنا اثر دکھاتا ہے۔ ناؤل نگار کرداروں کے ساتھ جذبے کی آمیزش بھی کردیتا ہے جبکہ سوانح نگار کو فنی لحاظ سے اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تجھے کہ سوانح نگار کو اپنے موضوع سے محبت یا نفرت ہو سکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ غیر جانبداری کے ساتھ ہیرو کی زندگی کو پرکھتا ہے اور ادبی سانچے میں ڈھال کر اسے پیش کرتا ہے۔ مارکٹ شوٹ جس نے چوسر اور شیک پیر جیسے افراد کی سوانح عمریاں مرتب کی ہیں ایک جگہ لکھتا ہے:-

”جب تک کسی ہیل کو قوانین کے مطابق نہ کھیلا جائے اس میں کوئی مزا نہیں ہے۔ کسی بھی سوانح نگار کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ سچ کہہ ڈالنے کی ضرور کوشش کرے۔“<sup>۲</sup>

موجو دور میں خودنوشت سوانح عمری کی ترقی کو دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوانح عمری اور خودنوشت سوانح عمری کا فرق واضح کیا جائے۔ خودنوشت یا آپ بنتی کی مقبولیت بھی سوانح عمری سے کم نہیں رہی ہے۔ اس کی مختلف تعریفیں پیش کی گئی ہیں لیکن ابھی تک کوئی جامع اور معتبر تعریف سامنے نہیں آئی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اس کی تعریف کچھ اس طرح ملتی ہے:-

”خودنوشت سوانح نگاری کا سوانح نگاری سے بہت قریبی تعلق

۱۔ ممتاز فاخرہ۔ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۳۷۔ ۳۸۔

۲۔ ممتاز فاخرہ۔ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۳۲۔

ہے یا یہ کہ خودنوشت سوانح نگاری سوانحی ادب کی ایک خاص شکل ہے۔ یہ (خودنوشت) ایک شخص کے حالات زندگی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود قلم بند کئے ہوں۔ اس لیے یہ پوری نہیں ہوتی یا،<sup>۱</sup>

مذکورہ بالا تعریف کے مطابق خودنوشت سوانح نگاری کا تعلق سوانح نگاری سے بہت گہرا ہے۔ خودنوشت میں سوانح نگاری کی حیثیت ہیرو کی ہوتی ہے۔ سوانح نگاری کے دائرے میں شامل ہونے کے باوجود یہ اپنا آزاد، منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے لیکن تاریخی اعتبار سے پہلے سوانح نگاری کافن بام عرونج تک پہوچا اور خودنوشت سوانح نگاری کافن اس کے سایے میں پروان چڑھا اس لیے موخر الذکر پر اول الذکر کے گھرے اثرات ہیں۔ خودنوشت کے اصول اور ضابطے سوانح نگاری سے مانوذ ہیں لیکن خودنوشت کے مصنف کا انداز جدا گانہ ہوتا ہے۔ اس کا قلم اپنے جذبات و احساسات اور مشاہدات کو عوام تک پہوچانے میں بے باک اور آزاد ہوتا ہے۔ وہ خود ہی اپنی ذات کا محور ہے، خود ہی نظر ہے اور خود ہی آئینہ۔ اور اس آئینے میں اپنی زندگی کے تجربوں، مشاہدوں اور ان سے پیدا ہونے والی انسیائی کیفیات کا ناظر بھی ہے۔ خودنوشت کا مصنف خود اپنے قلم سے واقعات کو تحریر کرتا ہے اس لیے وہ خود اپنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اپنے قلم سے دوسروں کو اپنے تجربوں میں شریک کرتا ہے اور اپنی کہانی سناتا ہے جب کہ سوانح حیات میں ہیرو کے فراہم شدہ واقعات اور حالات کو مرتب کیا جاتا ہے۔

روزنامجھوں، یادداشتوں، مکاتیب اور سفرناموں وغیرہ کا شمار خودنوشت سوانح عمری کے خام مواد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خودنوشت سوانح عمری میں جذباتی انتشار یا خود پرستی کا اندریشہ بھی ہوتا ہے لیکن یہ قاری کو صاحب سوانح کے باطنی اسرار و رموز سے واقف کرانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں قاری صاحب سوانح کی شخصیت کے خط و خال کا عکس دیکھ سکتا ہے۔

۱۔ دہان الدین علوی۔ اردو خودنوشت فن و تحریر، دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۳۲

شرط یہ ہے کہ ہیر واپنے ذاتی حالات کو بلا کم وکالت پیش کرے ورنہ واقعات اور کارناموں میں مبالغہ آرائی آپ جتنی کوافسانہ بنادے گی۔

مختصر ایک فن سوانح زگاری ایک شعوری مگر تخلیقی عمل ہے۔ سوانح زگار کو موضوع کا انتساب کرنا پڑتا ہے۔ اس کے حدود کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ واقعات کو فراہم کرنا اور انہیں چالی کی کسوٹی پر کسنا پڑتا ہے۔ یہ سارے مراحل ہیں جن سے سوانح زگار کو گذرنا پڑتا ہے۔ خام مواد کی جستجو سے لے کر اس کو منظم انداز میں پیش کرنے تک تخلیقی عمل کا ایک طویل سلسلہ ہے جس سے سوانح زگار کو عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ وہاں الدین طلوی فن سوانح پر رoshni ڈالتے ہوئے بڑے جامع الفاظ میں لکھتے ہیں:-

”سوانح زگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مرکز سوانح زگاری کے ہر معمولی سے معمولی مگر نتیجہ خیز عمل کو اس کی شخصیت اور سیرت کے ہر مرقع میں سجا کر پیش کرے۔ سوانح زگار کا کام واقعہ کو من و عن پیش کرنے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ اسے ایک ایسی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے جسے ہم فن کارانہ بصیرت کا نام دے سکتے ہیں جس سے انسانی زندگی کی گوناگون کیفیات کی فن کارانہ ترجمانی ہو سکتی ہے۔ مختصر اکہا جا سکتا ہے کہ سوانح حیات ادب کی وہ صنف ہے جو کسی خاص فرد کی زندگی کا عکس پیدا شد سے موت تک پیش کرتی ہے۔ اس کی تمام تر کامیابیوں اور ناکامیوں نیز اس کی زندگی کے اہم واقعات اور نفسیاتی کیفیات کو وچھپے ادبی انداز میں اجاگر کرتی ہے۔“



## باب دوم

# سوانح نگاری کا ارتقاء۔ حالی کے عہد تک

اُردو سوانح نگاری کا پس منظر عربی اور فارسی سوانحی تصانیف میں ملتا ہے۔ چنانچہ عربی اور فارسی سوانح نگاری کا تذکرہ نامناسب نہیں ہو گا۔ قبل اسلام کی مشہور تصنیف ”الاکلیل“ کے سوانحی موضوع بادشاہوں تک محدود ہیں لیکن اسلامی دور کی سوانحی تصنیفوں میں موضوع کے انتخاب میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے باوجود سوانح نگاری کے پچھے جو جذبہ کا فرمائ ہوتا تھا وہ مذہب اور بانی مذہب سے متعلق تھا۔ قرآنی احکام کی وضاحت کے لئے احادیث اور سیریا مغازی کی تدوین کی ضرورت ہوتی تھی اور ان کی صحت کے پیش نظر راویوں کے کردار کی جائیج پر کہ ہوتی تھی۔ ایسا پیغمبر اسلام کے عہد میں شروع ہو چکا تھا۔ خلفاء نے اسے مزید ترقی دی۔ حضرت عمرؓ نے اس ضمن میں خاص توجہ دی۔ انہوں نے حکم دیا کہ غزوات نبوی کا خاص حلقة درس قائم کیا جائے۔ اس زمانے میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کی وجہ سے سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا۔ بعض خاص اصول و معیار بھی مقرر کیے گئے۔ اس دور میں تاریخ نویسی اور سیرت نگاری دونوں ہی میں پچھان ہیں اور تلاش و تفہص کا رجحان بھی نمایاں ہوا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ فتن سیرت و مغازی و رجال، علم حدیث کی تدوین کی کوشش کا نتیجہ ہیں اور ایک ہی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حدیثوں کی تتفقیح سیرت کے مقابلے میں زیادہ اعلیٰ معیار رکھتی تھی۔

سید شاہ علی نے ان مصنفوں کو جنہوں نے سیرت کی تدوین میں توجہ کی، تین

طبقات میں تقسیم کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اصحاب مغازہ جن میں سے بہت کم جمع و ترتیب روایات میں محتاط تھے۔ ان

میں شریعت بن سعد، امام زہری، ہشام بن عردوہ اور ابن الا شیر قابل ذکر ہیں۔

۲۔ محمد شیعہ کرام جو روایات کو مسانید کے انداز پر لکھنے کے باوجود صحابہ کے حال میں جرج و تنقید کو بھول گئے۔

۳۔ حکماء، اہل حدیث جن میں فقہاء، حکماء، رجال و علم شامل ہیں اور جو مند، ابواب، تاریخ اور کئی پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ ان میں امام شعبی، مالک و بخاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بہر حال عربی زبان کی زیادہ قابل اعتماد سوانح عمریاں وہ ہیں جو سیرت رسول پر لکھنے والوں کے انداز سے متاثر ہوئیں۔ رسول کے سیرت نگار ایک طرف تفصیلی جزیئات قلم بند کرتے تھے تو دوسری طرف روایتوں کی صحت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں خود راوی کے حالات و کردار کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ ان کے ماسوا خلفاء، وزراء، سفیروں اور فوجی افسروں کے حالات بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان سب کی بنیاد مخصوص روایت پر ہے۔ شعراء وادباء کی سوانح عمریوں پر بہت کم توجہ دی گئی۔ شاعروں کے حالات میں ٹھیکی کی "الشعر و الشعراء"، اردو شاعروں و موسیقاروں کے حالات میں ابوالدرج الاصفہانی کی کتاب "الاغانی" اور آنھوں صدی ہجری کے شاعروں کی سوانح عمریوں کے لئے "الدرالکاس فی الشعراء"، "القرآن الشامن" وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ تاہم سوانح عمریوں میں اعلیٰ سوانح عمری کے بہت سے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک عصر بھی جزیئات کی فراہمی ہے۔ یہاں بھی سیرت رسول کے انداز نے بڑا فائدہ پہنچایا۔ آنحضرت کی زندگی کے عام حالات اور اندر وطن خانہ کی ہر ہر بات کتابوں میں موجود ہے۔ اس سے وہ حجاب دور ہو جاتا ہے جو غلطیم شخصیات کے خلوت و جلوت کے درمیان حائل رہتا ہے۔ تقریباً چار صدیوں تک سوانح عمری کا یہ تصور عربی ادب پر چھایا رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ملوکیت کے اثر

سے انسان کی زندگی کے دو دائرے جلوت و خلوت مقرر ہوتے گئے۔ اسی طرح عام انسان اور بادشاہ دو الگ قسم کی مخلوق قرار رکھا گیں۔ اس لئے انسان اور انسانیت سوانح عمری کے موضوع سے خارج ہوتے گئے۔ ایسا کس طرح ہوا، ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

”مگر تاتاریوں کے حملوں اور اندر ونی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کے باعث علوم و فنون کی روح مردہ ہو گئی اور جنمی تمدن کے اتصال سے تکلف اور تصنیع نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا چنانچہ اب اصیلیت کے بجائے بے جامدح سرائی اور بے باکی کی جگہ خوشنامہ اور تصنیع نے لے لی۔ پھر دربارداری کی رسم نے اس رنگ کو اور زیادہ شوخ کر دیا۔“

جبکہ تک فارسی سوانح نگاری کا تعلق ہے تو اس پر عربی کے اثرات نمودار ہوئے۔ قبل اسلام فارسی تراجم اور تذکروں کے موضوعات بادشاہوں اور ان کے درباروں تک خاص تھے جنہیں میرالملوک اور آداب الملوك کہا جاتا تھا۔ جب اسلام آیا تو عربی کے اثر نے ان کے موضوعات میں وسعت پیدا کی حتیٰ کہ مواد اور اصول و خوابط بھی عربی کے مثل ہو گئے۔ فارسی میں بھی متعدد سیر رجال یا فقہی سوانح عمریاں لکھی گئیں یا عربی سے ترجمے کی شکل میں آئیں۔ عربی قرآن کی زبان ہونے کے وجہ سے اکثر فقہی اصناف کی زبان بھی رہی لیکن جب عبد صفوی میں شیعہ فقہ نقطہ عروج پر تھی تو ایسی اصناف خصوصاً فارسی زبان میں لکھی گئیں۔ جن ابتدائی کتابوں میں سوانحی مواد ملتا ہے ان میں محمد ابن طوسی (وفات ۲۰۲ھ) کی فہرست شوکت الطائفۃ، شیخ احمد کی اسماء الر جمال، محمد بن علی کی معالم العلماء، حسن بن یوسف کی ایضاہ اشتباه، روضۃ الجنة، فضائل العلماء اور کشف الحجوب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ایرانی مصنفوں نے اکثر مخصوص انسانی طبقوں یا جماعتوں مثلاً وزراء، اطباء، شعراء وغیرہ کے تذکرے لکھے ہیں یا تاریخی واقعات کو بالترتیب سنبہ وار ذکر کیا ہے فضائل الانبیاء ۱۹۷۳ء میں لکھی گئی جس میں ڈیڑھ سو شیعہ علماء کے حالات ملتے ہیں۔ خود نوشتہ فارسی سوانح عمریوں میں سب سے اہم

اور قبل ذکر شیخ علی حزین کی آپ بیتی ہے۔ اس میں ۲۲ءے میں اصفہان پر افغانی حملے کے پیشہ دید حالات کا بیان ہے۔

فارسی شعراء کے تذکروں میں ان کی سوانح عمریاں اور ان کے کلام کا انتخاب ملتا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرتے چلیں کہ تذکرہ نگاری کی راویت ہمیں عربی زبان ہی سے ملتی ہے اور اس زبان کا سب سے پہلا تذکرہ ابن سلام نے "طبقات الشعراء" کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں شعراء جاہلیت و اسلام کے عینده علیحدہ طبقات قائم کر کے ان کے حالات اور کلام کے نمونے درج کیے گئے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اہل ایران مشرف پر اسلام ہونے کے بعد نہایت سرگرمی سے زبان و ادب اور علوم و فنون کے میدان میں عربوں سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے اور ایران و عرب کی ادبیات میں ایک نہ ختم ہونے والا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ابتدائی چند صد یوں کے یہی ادبی و ثقافتی روابط فارسی میں تذکرہ نگاری کے آغاز کا سبب بنے۔

اکثر تذکروں میں کلام کا انتخاب زیادہ اور شعراء کے حالات برائے نام ملتے ہیں البتہ ان میں فارسی ادب کی تاریخ کا مواد کثرت سے ملتا ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اردو تذکروں میں بھی بعد میں یہی خصوصیات ملتی ہیں اور اردو تذکرہ نگاری کے ذکر کے ذیل میں ہم تذکروں کی سوانحی اہمیت بیان کریں گے۔ سید شاہ علی ان تذکروں کی تقسیم و خصوصیات میں کرتے ہیں یہیں<sup>۱</sup>

- (۱) عام تذکرے: جن میں آغاز سے تذکرہ نویس کے عہد تک کے حالات ہوتے ہیں۔
- (۲) خاص تذکرے: جن میں صرف کسی مخصوص دور کے شاعروں کا حال ہوتا ہے۔ اول الذکر قسم میں تین صورتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یعنی مختلف تاریخی ادوار، حکمرانوں یا خاندانوں کے لحاظ سے شعراء کے حالات کا بیان یا (۲) تخلص کے لحاظ سے ترتیب یا ہر ایک حرفا کے تحت تاریخی ترتیب یا (۳) جغرافیائی لحاظ سے مثلاً اقلیموں، ملکوں اور شہروں کے لحاظ سے شعراء کی پیدائش یا قیام کے لحاظ سے یا پیشہ یا مشغله کے لحاظ سے ترتیب (مثلاً حکمرانوں، شہزادوں، وزیروں، ہمائد، عہدہ داروں،

<sup>۱</sup> سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی ۱۹۷۴ء، ص ۱۰۸

انہما، فضلا، خوش نویسون، ظریفون وغیرہ کے) شاعروں کی سوانح عمریاں خصوصاً متاخر زمانہ سے جب کہ سام مرزا بن شاہ اممعیل نے تخفہ سامی لکھ کر اس کو رواج دیا۔

فارسی میں تذکرہ نگاری کی ابتداء سید الدین محمد بن عوفی کے "لباب الاباب" سے ہوتی ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب ۲۱۸ھ (۱۲۲۱ء) کے قریب مکمل میں آئی۔ یہ تین سو شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے اور دو جلدوں میں تقسیم ہے۔ ان دونوں جلدوں میں بارہ ابواب ہیں جن میں شروع کے چار ابواب فن شعر کے بارے میں علمی و تاریخی بحث سے متعلق ہیں۔ بعد کے ابواب میں شعرا، کوآن کی سماجی حیثیت شعرو شاعری سے شغف کی نوعیت اور زمانی و مکانی اختلاف کی بنیادوں پر مختلف عنوانات اور فصلوں کے تحت علیحدہ علیحدہ جگہ دی گئی ہے۔

معلوم ذرائع کے مطابق فارسی کے "لباب الاباب" کی ترتیب کے تقریباً پونے تین سو سال بعد تک کوئی تذکرہ نہیں لکھا جا سکا۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی دولت شاہ سمرقندی کا "تذکرۃ الشعرا" ہے جو ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) کے قریب مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ دیباچے اور خاتمے کے علاوہ سات طبقات پر مشتمل ہے۔ ہر طبقے کے ذیل میں کم و بیش ہیں۔ ہیں شاعروں اور ان کے سرپرست امراء و سلاطین کا ذکر ہے۔ اس کے بعد شعرا، اردو کے پہلے تذکرے کی ترتیب (۱۱۶۵ھ) سے قبل تک تقریباً پونے تین سو سال کی درمیانی مدت میں شعرا، فارسی کے تقریباً چالیس تذکرے معرض وجود میں آچکے تھے۔ ان میں غالب تعداد ان تذکروں کی ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے۔

اسلنے جہاں برصغیر ہندوپاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ فارسی زبان کے شاعروں کا پہلا تذکرہ اس کی سر زمین پر مرتب ہوا وہیں یہ امتیاز بھی اس کے حصے میں آیا ہے کہ تذکرہ نویسی کی ترقی میں یہاں کے اہل قلم کی کوششیں ہر دور میں ایرانی ادیبوں کی کاوشوں سے افضل رہی ہیں۔ ہندوستان میں مرتب ہونے والے فارسی تذکروں سے اردو تذکرہ نویسی کے آغاز وارتقاء کی داستان براہ راست وابستہ ہے۔

مشہر سلف کی سوانح عمریوں میں جو تصنیفات فارسی میں ملتی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:- انیس الارواح از خواجه معین الدین چشتی متوفی ۶۳۲ھ جوانہوں

نے اپنے مرشد عثمان باروٹی کے حالات میں لکھی، انیس الطابین از محمد صالح الدین بخاری جو شیخ بہاء الدین نقش بندی کے حال میں ہے۔ نعمۃ الشتمس جو شمس الدین اور شاہ نعمت اللہ کے حالات میں لکھی گئی۔ تعلق نامہ اور تاریخ فیرز شاہی جن سے محمد تعلق اور فیروز شاہ کے حالات کے وضاحت ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ بعض ایسی کتابیں جو ہندوستان کے مسلم فاتحوں اور فرمان رواؤں سے متعلق لکھی گئیں ان میں تو زک تیموری، تو زک بابری، ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم، تو زک جہانگیری وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں بڑی صاف گوئی اور فرانخ دلی کا اظہار پایا جاتا ہے۔ البتہ ان کا شمار کسی باقاعدہ صنف کے تحت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان میں یادداشت، روزنامچے اور آپ بیتی کے مختلف عناصر بے یک وقت پائے جاتے ہیں۔ قدیم سوانحی کوششوں میں سفیہۃ الاولیاء از دارالشکوہ (۱۵۱۷ھ) بھی قابل ذکر ہے۔

جب ہم اردو سوانح نگاری کی ابتداء پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری زکاء ذکنی ادب پر جاتی ہے۔ یہ دکن ہی ہے جہاں اردو آریائی اصل کے باوجود اپنے سرچشمے سے دو رسم موافق ناماؤں فضایاں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اردو ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ہندوستان کے مخصوص معاشرتی، اقتصادی، اور سیاسی حالات کی بنیاد پر اردو نظم نے پہلے ترقی کی اور نشر کی ترقی رکی رہی کیونکہ ادبی نشر کے عروج کے لئے ایک مخصوص قسم کی فضا اور سماجی کشمکش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے جس وقت اردو سودا، میر اور غالب جیسے مستند شاعر پیدا کر پکھی تھی، اردونشر میں وجدی کی، ”سب رس“ انشاء کی ”رائی کیتکنی کی کہانی“، سرور کی ”فسانہ عجائب“، اور فورٹ ولیم کالج کی ابتدائی نشری کوششوں کے سوا کچھ اور قابل ذکر نہ تھا۔ یہاں تک کہ احتشام حسین یہ حقیقت بھی ہم پر آشکار کر دیتے ہیں کہ ”اردونشر کی ترقی میں اتنا عرصہ لگا کہ آج بھی ہم نشر نگاری میں اس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں نظم میں ایک صدی پہلے پہنچ چکے تھے۔ یہ بات صرف تعداد اور مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ معیار اور خصوصیات کے لحاظ سے بھی دیکھی جاسکتی ہے یا“

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نشر کی ترقی کی رفتارست ہونے کی وجہ سے سوانح عمری بھی توجہ سے محروم رہی۔ اردو کی نظم و نشرونوں سلسلے میں دکن کو اولیت حاصل ہے۔ دکن کی ابتدائی شاعری میں منظوم سوانح عمریاں ملتی ہے جو یا تو درباروں میں لکھی گئیں یا مدد بھی اثرات کے ماتحت۔ اردو کی پہلی سوانحی تصنیف کے سلسلے میں نقادان فن شہباد کا شکار ہیں۔ اور وہ یقینی طور پر کسی تصنیف کو اردو کی پہلی سوانح عمری نہیں کہہ سکے مثلاً احتشام حسین کا خیال ہے:

”یہ بالکل صحیح نہیں بتایا جا سکتا کہ سب سے پہلی کتاب جسے سوانح عمری کہہ سکیں کب اور کہاں لکھی گئی۔ ”مجموعہ قصص“ کے نام سے کتب خانہ انڈیا آفس میں ایک کتاب ہے جس میں نیم تاریخی اور تاریخی واقعات افراد کو مرکز بنا کر لکھے گئے ہیں لیکن جیسا کہ خود اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، لکھنے والے کے پیش نظر ”قصہ چن“، ”تحاسیرت نگاری“ وغیرہ نہ تھی۔ اگر فضل کی ”دہ مجلس“ کو امام حسین کی سوانح عمری مان لیں تو پھر ایک کتاب ۱۳۲۷ء کے قریب بھی ہمیں مل جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ”روضۃ الشہداء“ میں جس سے یہ کتاب مأخوذه ہے امام حسین کی سیرت سے زیادہ واقعات کر بلکہ مجموعی حدیثیت سے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ پھر حیدر بخش حیدری نے ۱۸۱۲ء میں اس کتاب کا خلاصہ ”گل مغفرت“ کے نام سے شائع کیا۔“

لیکن فیروز کی ”توصیف نامہ“، کو نصیر الدین باشی نے اردو کی سب سے قدیم سوانح عمری قرار دیا ہے۔ دیگر سوانحی تصنیفیں میں مجی الدین نامہ از فضل (۱۰۵۰ھ کے بعد کی تصنیف) غوث نامہ از شاہ حسین ذوقی، محبوب القلوب از باقر آگاہ ۱۲۰۷ھ کے موضوع عبدالقدار جیلانی ہیں۔ اسرار عشق از مؤمن، فیض عام قدس (۱۱۲۵ھ) مترجمہ شہاب الدین، سید محمد جو پوری بانی فرقہ مہدویہ کے حال میں ہے۔ ریاض الجنان

(۱۲۰ھ)، تخفہ احباب اور حنان السیر از باقر آگاہ کے موضوع، پیغمبر اسلام، خافعے راشدین، انبیاء، وائے، بزرگان دین، اہل بیت، شہداء کے کربلا ہیں۔ ابراہیم نامہ (۱۰۱ھ) از عبدل، قطب مشتری (۱۰۸ھ) از وجہی، علی نامہ (۱۰۶ھ سے ۱۰۷ھ تک) از نصرتی کے موضوع مختلف شاہان دکن ہیں۔ مؤخرالذکر مشفنویاں اردو ادب میں بہت مشہور ہو چکی ہیں۔

در اصل ستر تھویں صدی عیسوی میں گولکنڈہ اور یجاپور کی دکنی ریاستوں کے نزیر سرپرستی اردو ادب کے او لین لیکن اعلیٰ اور پختہ نقش ڈالے گئے۔ قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، غواسی اور ابن نشاطی کے نام اردو ادب میں اسی لئے فراموش نہیں کیا جاسکتے کہ انہوں نے مختلف اصناف ادب پر قلم انداز کر اس نومولود زبان کے وسیع اور لامحدود امکانات کی طرف رہنمائی کی۔ خاص طور سے نصرتی کو شخصیت نگاری سے بے حد لگاؤ سے اور وہ اس فن پر خاصی قدرت رکھتا ہے۔ ”علی نامہ“ میں نصرتی نے علی عادل شاہ کی تخت نشینی مغلوں اور مرہٹوں سے جنگ و بیکار کے مختلف واقعات کا چشم دید افسوسیلی، مرتب، مربوط اور مستند بیان کیا ہے۔ میدان جنگ کے نقشوں، فوجوں کی خصوصیتوں، افسروں اور سپاہیوں کے کردار، روزمرہ زندگی کے واقعات، اتم و عز اداری کا بڑا اچھا ذکر ملتا ہے۔ نصرتی کی ”گشن عشق“ اور امین کی ”بہرام“ اور بانو حسن“ میں شاعر کے ذاتی حالات کا بیان بھی ملتا ہے۔ ”گشن عشق“ میں ”حسب حال خود“ کے تحت نصرتی نے اپنے والد کے اوصاف و عادات، اپنے بچپن کی تعلیم و تربیت اور ذوق شاعری سے لگاؤ کا حال قلم بند کیا ہے۔ مزید اپنی جوانی، شہزادہ علی سے قربت و یگانگت کا حال بیان کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے مذہبی عقائد اور ان پر پابندی، اپنے دوستوں کا ذکر بھی شامل کیا ہے۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے اور یہ فخر بھی کیا ہے کہ باوجود اپنے گناہوں کے وہ مذہبی فرائض کے ادائیگی سے غافل نہیں رہا۔ اس کے کلام سے ہم پر یہ بھی منکشف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی خانگی زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔

واضح رہے کہ یہ تصنیف مذہب و اخلاق اور تاریخ و سیاست سے زیادہ متاثر ہیں اور ان کا طریقہ بیان خالص سوانحی نہیں ہے۔ ان سے صرف اتنا اندازہ کیا جاسکتا ہے

کہ اردو کے ابتدائی دور میں کس درجہ سوانح نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ لہذا انہیں باقاعدہ سوانح نگاری سے منسوب کرنا فاش غلطی ہو گی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گیا رہوں صدی ہجری یا سترہوں صدی عیسوی میں اردو زبان اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے مختلف عناصر کو مٹنو یوں اور دیگر منظوم صورتوں میں سبودے۔ بارہوں صدی ہجری میں دکن میں ہم کو زیادہ ترتیب یافتہ تصویر اور عناصر ملتے ہیں۔

قطب مشتری اور علی نامے میں اپنے بادشاہوں کے حالات کے علاوہ اس زمانے کے تاریخی واقعات و معز کہ جات، روایات اور طرز معاشرت، تہذیب و تمدن کی بھی تفصیل ملتی ہے۔ بعض میں مختلف حالات ماذئے گئے ہیں۔ مشائی و جسمی نے ”قطب مشتری“ میں اپنے ہم عصر قلی قطب شاہ کو ہیر و بنایا ہے۔ اس میں قلی قاب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کا واقعہ استعارۃ درج ہے۔ اس مٹنوی سے وجوہی کی تعلیم، تربیت، مالی حالت، ہم عصر شاعروں سے چشمک اور کشمش کا عال بھی کھلتا ہے۔ علی نامہ کی طرح اس میں بھی سوانح عمری اور آپ بیتی دونوں کے عناصر ملتے ہیں۔

ایک اور شاعر ملک خوشنود، محمد قلی قطب کا پروردہ غلام تھا۔ اس کی مٹنوی یوسف زلینجا کا کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن اس نے مٹنوی ”بہشت بہشت“ کے دیباچہ میں اپنا اور اپنی شاعری کا حال لکھا ہے۔ خاور نامہ ایک رزمیہ مٹنوی ہے جسے کمال خاں رستمی نے لکھا۔ اس میں حضرت علی کی اپنے عصروں سے جنگوں کا بیان ہے۔ یہ اس نامہ کی فارسی نظم ”خاور نامہ ابن حسام“ کا لفظی ترجمہ ہے اور ۱۹۵۹ء میں خدیجہ سلطان کے حکم پر لکھی گئی تھی۔ بعد کے زمانے کی جو مٹنویاں ملتی ہیں ان میں قصہ گولی پر زیادہ زور ہے۔

اس دور کی مذکورہ دکنی مٹنویوں (جن میں سوانحی عناصر موجود ہیں) کے مقابلے میں شماں ہند میں اس انداز کی نظم و نثر کا کوئی نمونہ نہیں ملتا اور اس میدان میں یکسر ناتا چھایا ہوا ہے۔ درحقیقت یہ ایک خاص ماحول اور سیاسی ابتوں کا نتیجہ ہے۔ ہم تاریخی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے لیکن اتنا ضرور عرض کر دیتے ہیں کہ وہ دور بے سکونی اور اضطراب کا دور تھا۔ عیش و عشرت کے ماحول اور آپسی خانہ جنگی سے معاشرہ زوال پذیر ہو رہا تھا۔ چنانچہ اردو کے اہل قلم اور باشمور شخصیتیں ایک سو گوار فضا اور گھٹاٹوپ

اندھیرے میں نکر مارتی رہیں۔ ان حالات میں افتشار و بد امنی اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے اندر منظم اور سنجیدہ ادب کا کاپھلانا پھولنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شاعری اور خصوصاً غزل کے دامن میں ادباء نے پناہ لینے کی کوشش کی اور اپنے دلی جذبات کو غزل کی لے میں بخندنا کرنے کی جرأت کی۔ ایسی حالت میں سوانح نگاری جیسی سنجیدہ اور منظم صنف ادب کی باقاعدہ تلاش بیکار معلوم ہوتی ہے۔ سوانح نگاری کے لئے مصنف کا ذہنی انتشار، نفرت یا شدت، سُم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابتداء اس دور میں ہمیں چند غیر شعوری کوششیں ضرور ملتی ہیں۔ شمالی ہند میں بھی سوانح نگاری کے نقوش غیر شعوری طور پر مرشیدہ گولی سے ابھرتے ہیں۔ مرشیدہ نگاری کی دوستی میں ہوتی ہیں۔ ایک میں کربلا کے مخصوص واقعہ کو لے کر متعلقہ افراد کی سیرت و کردار کو سفی قرطاس پر از سر زواجاً گر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسری قسم ذاتی مرشیوں کی ہوتی ہے۔ یہ ہم عصر والی سیرت کے نمایاں خدوخال کو ابھارنے میں کامیاب ہوتے ہیں مثلاً غالب، موسن، بیتلی، چکبرت، اقبال وغیرہ کے مرشیدے۔ ان میں سیرت نگاری، حقیقت پسندی اور نفیاقت اثر انگلیزی زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس طرح ان مرشیوں میں سوانحی اجزاء تو ضرور کار فرمائ ہوتے ہیں لیکن انہیں سوانح نگاری کی کسی باقاعدہ صنف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ سوانح نگاری کے اصول و معیار پر پورا اتر نے کے لئے اکثر سوانحی ارادے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ الطاف فاطمہ<sup>لهمہ</sup> ہوتی ہیں:

”اس طرح انہیں کتابوں میں سیرت نگاری کی او لین بنیادیں مل جاتی ہیں اور اس طرح ہمارے لکھنے والے غیر شعوری طور پر سوانح نگاری کی داغ بیل ڈالتے جا رہے تھے اور سیرت اور شخصیت نگاری کا وہ نجج جواب تداء ہی سے اردو کے بخراز میں میں ڈال دیا گیا اب آہستہ آہستہ اس میں اکھوا پھوٹ رہا تھا بلکہ وہ سر اٹھا رہا تھا یا“

بعد ازاں اردو تذکرہ نگاری کا دور آتا ہے۔ عربی اور فارسی تذکرہ نگاری کا ذکر

آچکا ہے اور ہم نے یہ بھی اشارہ کر دیا تھا کہ اردو شاعری کی طرح اردو شاعروں کے تذکرے بھی فارسی سے متاثر ہیں۔ بلکہ ان کی زبان بھی اکثر فارسی ہی رہی۔ گرچہ انہیوں صدی کے آغاز اور وسط میں بعض اردو تذکرے ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد براۓ نام ہے۔ گارساں و تاسی نے ۱۳۱۳ تذکروں اور بیاضوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں صرف ۶ تذکرے اردو زبان کے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ میر کے تذکرہ نکات اشعار، (۱۷۱۸ء) اور و تاسی کے تذکرے (۱۸۱۸ء) تک چند کو چھوڑ کر اردو تذکرہ نگاری پر کچھ فرق نہیں پڑا۔ کاغذیہ رہا لیکن زبان کے بد لئے سے موضوع، مواد یا بیان پر کچھ فرق نہیں پڑا۔

ولی دکنی کی وفات ۱۷۰۰ء میں ہوئی۔ دکن اس وقت تک پوری طرح مغلوں کے زیر اقتدار آچکا تھا اور سیاسی معاشری نظام کی وحدت نے شمال و جنوب کے درمیان تہذیبی لین دین اور ثقافتی ربط و ضبط کے راستے کافی حد تک ہموار کر دیے تھے۔ ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے اور کچھ سالوں بعد ان کا دیوان بھی آیا جو شماں ہند میں اردو شاعری کے فال نیک ثابت ہوا۔ ولی کے کلام کی مقبولیت نے شمالی ہند میں اردو شاعری کے ارتقا کی رفتار پر بڑے خوش ائمہ اشوات مرتب کئے۔ فارسی کی رونق ختم ہونے لگی کیونکہ اردو ایک طاقت و رحریف کی حیثیت سے اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ مختصرًا متعدد شعراً مثلاً محمد شاکرناجی، شیخ شرف الدین مضمون، مصطفیٰ خاں یک رنگ، شاہ مبارک آبرو، مرزامظہر جان جاناں، شاہ حاتم، صدالدین فائز وغیرہ قدر شناس نگاہوں کا مرکز قرار پائے۔ فارسی کی جگہ اردو کو مسند اقتدار پر لے آنے کا یہ رجحان جس تیزی کے ساتھ عوام و خواص میں مقبول ہوا، تاریخِ ادب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کو مرکزیت ملنے اور اس کی بنیاد میں مستحکم ہونے کے ساتھ دکن کا چدائغ گل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ولی کے بعد اس علاقے سے سراج اور نگ آبادی کے علاوہ کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ولی نے غزل کی صنف کو اپنی تمام تر توجیبات کا مرکز بنایا کہ جس رمز شناسی اور دیدہ و ری کا ثبوت دیا تھا اس کا اندازہ دکن والوں کے مقابلے میں شمالی ہند کے لوگوں نے زیادہ بہتر طور پر کیا۔ شمالی اردو شاعری کی تاریخ دراصل غزل کے ارتقاء کی تاریخ ہے اور

تذکرہ نگاری کے فن نے تاریخ کے اس وسیع مسلمے کی ایک کڑی کی حیثیت سے ترقی کی ہے۔ تذکروں کے بارے میں سید عبداللہ کا خیال ہے کہ:

”تذکروں میں قیمتی سوانحی مواد موجود ہے لیکن وہ بذات خود مکمل

سوانح عمری کے قائم مقام نہیں ہیں بن سکتے یا تذکرہ سوانح نگاری کے فن کی ایک شاخ ہے جس کواغت اور سوانح کا مرکب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں حالات و واقعات پچھزیزادہ نہیں ہوتے۔

صرف چیزوں واقعات و میئے جاتے ہیں اور سنین کا اتزام بھی کم ہوتا ہے۔ تذکرہ افراد کی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات پیش کرتا ہے۔ وہ صرف اس اجتماعی جماعتی ذوق کی تشفی کرتا ہے جس کی ہماری تہذیب نے شروع سے پرورش کی ہے۔“

تذکروں میں کئی خامیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جیسے ان میں مشہور مؤلفین اور دوستوں کی مدح سرائی دل کھول کے کی جاتی ہے اور اس طرح تذکرہ نگاروں کو اپنی فصاحت، بلاغت اور انشا پردازی کے جو ہر دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ وہ عمدہ عمدہ اشعار کا انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں۔ گارساں دتسی نے تذکرہ نگاری کے مسلمے میں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جس کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان تذکروں کی تالیف کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا بلکہ تذکرہ نگاروں کے پیش نظر دو باشیں ہوتی تھیں۔ اول اپنی فصاحت، بلاغت اور انشا، پردازی کا اظہار۔ دوم یہ کہ شعراء اپنی بیاضیں رکھتے تھے جن میں ہم عصر شعراء کے نمونہ مائے کلام کے ساتھ ساتھ اپنی رائے اور پسند کا اظہار بھی کر دیتے تھے اور اس ضمن میں کبھی کبھی ایک دو جملے یا چند سطراں شاعر کی ذات کے متعلق بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کا مقصد سیرت نگاری ہرگز نہیں تھا۔ تذکروں میں شاعروں کا انتخاب عظمت، سنجیدگی اور پختگی کے لحاظ سے نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ ان میں چھوٹے بڑے، سنجیدہ، ہزل گو، موجودہ اور سابق ہر طرح کے شعراء کا ذکر کیا جاتا تھا۔ ان میں سے نئے نام بھی شامل کر لئے جاتے تھے۔ موضوع

کے انتخاب میں تذکرہ نگاروں نے کسی طرح کے متعین کردہ اصول و خوابط پیش نظر نہیں رکھے بلکہ ہر تذکرہ نگار اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے لحاظ سے حالات کو مرتب کرتا تھا۔ کہیں شعراء کا ذکر حروف تہجی کے لحاظ سے اور کہیں ادوار میں انہیں تقسیم کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن تذکرہ نگاروں کے مطابعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ عموماً ان کے لکھنے والوں نے اپنے پیش روؤں کی تقریباً ہر معاملہ میں تقلید کی ہے اور شاذ و نادر ہی اپنی صنائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ گرچہ تذکرہ نگاروں میں شعراء کے انتخاب پر اعتراضات وارد کئے گئے ہیں لیکن یہ اعتراضات زیادہ تر ان کے ناموں کی عدم شمولیت پر یا ان کے حالات میں اختصار و تفصیل یا ان پر تنقید و تبصرہ کے نہمن میں ہیں۔ پھر بھی تذکرے کے موضوع کا انتخاب بہت حد تک تذکرہ نگاروں کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے تذکرہ نگاروں کے مواد کے سلسلے میں کس چیز پر انحصار کیا۔ دراصل انہیں اس معاملے میں زیادہ تر اپنی معلومات اور سنی شانی باتوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں قتل و حمل کے مسائل ہونے کی وجہ سے شاعروں کی اتصانیف اور دیگر تحریروں کی دستیابی محال تھی اور روز ناچبوں کا رواج ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس کے حصول میں اسی طرح وقت آتی جو دیگر تحریروں کے حاصل کرنے میں ہو سکتی تھی۔ کسی کو دوسرے کی زندگی میں داخل انداز ہونے کا حق حاصل نہیں تھا اور نہ ہی اس کو اچھا سمجھا جاتا تھا اس لئے بھی خطوط کو بھی ظاہر نہیں کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں جدید فرم کے سوانحی مواد یا خود نوشتہ سوانحی مواد کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

تمام کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ان تذکرہ نگاروں میں ایسی بہت سی باتیں مل جاتی ہیں جو ادب و تاریخ کے لئے اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے ذریعہ برسوں پہلے کی تہذیب و تمدن، اقتدار، معاشرت، ماحول کے مشاهدات، ادبی علمی محفلوں، مشاصل و تفریحات، مشاعروں، وضع داریوں، پاسداریوں اور نظام معاشرت کی تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں۔ تذکرہ نگاروں پر جو مختلف اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں نا انسانی، جانب داری، خودستائی، تحقیق کی کمی، شاعری کے ارتقا کی

جملک کا فقدان وغیرہ کے علاوہ ان کے تاریخ کی شاخ نہ ہونے کے ہیں، ان کے علاوہ ان تذکروں میں اختصار اور جامعیت دونمایاں بیانیہ رجحانات ہیں۔

نکات الشعراء از میر تقی میر اردو کا پہلا تذکرہ خیال کیا جاتا ہے۔ سیرت نگاری کے لحاظ سے یہ اپنے دور کا اہم ترین تذکرہ ہے اور اس میں پیش کئے ہوئے اُنچھے مختصر ہونے کے باوجود مکمل ترین ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۹۲۵ھ میں لکھا گیا اور یہ ۱۹۰۲ء شاعروں کے حالات پر مبنی ہے۔ باوجود اس کے کہ معترضین نے اس پر اختصار، نظر اندازی اور بے اعتنائی کے الزامات لگائے ہیں، اس پر اس کے مقلدین و مخالفین دونوں نے بہت کم اضافہ کیا ہے۔ نکات الشعراء میں اصلاحِ ختن، تنقیدِ کلام اور تصویر سیرت تینوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ سید شاہ علی لکھتے ہیں:

”میر پر معاصر تذکرہ نگاروں کے اعتراضات، دکنی شاعروں کی نظر اندازی، بعض اہم شاعروں کے ذکر میں اختصار، ان کے کلام میں اصلاح یا ان کی تنقید میں بے دردی (حالانکہ بعض معمولی شاعروں مثلاً تاباں کا ذکر) وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ میر کے دردناک ذاتی حالات اور نفیات اور ان کی زبان کے معیار اور ان کے منصب کے مدنظر ان اعتراضات کی وقت کم ہو جاتی ہے۔“

لیکن اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ سیرت نگاری کے لئے ایک بنیادی اصول غیر جانبداری اور متوازن اسلوب بیان ہے جو ہمیں میر کے یہاں مفقود نظر آتا ہے۔

تذکرہ شعراء اردو جو ۱۸۸۷ھ اور ۱۹۲۲ھ کے درمیان لکھا گیا، میر حسن کا ایک متوازن اور معتدل تذکرہ ہے۔ انہوں نے اپنے معترضین کی خوبیوں کی بھی داد دی ہے اور اپنے دادا میر صاحب کی ہزل گوئی کی بھی نہ مدت کی ہے۔ اس تذکرہ میں میر حسن نے حالات کی دریافت و تحقیق کے وسیع امکانات کے باوجود شعراء کے تعارف میں سوانحی پہلو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف سیرت و شخصیت کے بارے میں اظہار

۱۔ سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۳

خیال اور کلام کے متعلق رائے زنی سے سروکار رکھا ہے۔ چنانچہ اس تذکرہ میں شاہ فضح کے سال وفات کے علاوہ نہ تو کسی واقعہ کا سن مذکور ہے اور نہ عام طور پر معلوم مشہور زبانوں کے سوا کسی شاعر کی داستان حیات سے متعلق کوئی خاص مواد ملتا ہے۔ لیکن میر حسن نے کسی شاعر کے اوصاف ذاتی و صفاتی کی تعریف یا اس کی کوتاہیوں کے بیان میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ اگر کسی شخص کی ذات میں انہیں کچھ برائیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشان دہی کے ساتھ ہی وہ اس کی خوبیوں کی اعتراف کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

‘گلزار براہیم’، علی ابراہیم خاں خلیل کی تصنیف ہے جس میں تقریباً ۳۲۶ شاعروں کے حالات و اشعار ملتے ہیں۔ خلیل نے جن شاعروں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے ان کے بارے میں بالعموم ولایت، وطن، جائے سکونت اور سلسلہ معاش وغیرہ سے متعلق ان کی صراحتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر ویشور شعرا، کے ذکر میں ان کے حالات کی تخصیص کر کے اور دوسرے اہم واقعات کے سنین متعین کر کے انہوں نے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ مرزا علی اطف کا تذکرہ گلشن ہند اپنی نوعیت کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ گلکرنٹ کی فرمائش پر اطف نے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے ”گلزار براہیم“ کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی خدمت انجام دی۔ حیدر بخش حیدری کے ”گلشن ہند“ کے بعد شعرا نے اردو کا یہ دوسرا تذکرہ ہے جس میں اظہار مطالب کے لئے اردو زبان کو اپنایا گیا ہے۔ اطف کا ”گلشن ہند“ ۱۹۱۵ء مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ ترجمے کی شکل میں فورٹ ولیم کالج میں لکھا گیا تھا۔ اس میں خاص توجہ زبان و بیان کی صحت و صفاتی پر صرف کی گئی ہے۔ اطف نے بے ضرورت عبارت آرائی کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور جا بجا نفس مضمون میں بھی اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں لیکن یہ اضافے مفید اور کارآمد ہیں۔ گرچہ واقعات کے بیان میں بعض غلطیاں ہوئی ہیں پھر بھی اس تذکرے میں مفید اور معلومات افزای مواد کافی مقدار میں موجود ہے۔ خصوصاً لکھنؤ، عظیم آباد اور کلکتہ سے متعلق شعرا کے بارے میں ہمیں اس سے بہت سی اہم اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی

تاریخ میں اس اعتبار سے بھی اس تذکرے کی اہمیت کم نہ ہو گی کہ یہ وہ پہلی کتاب ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فنی تقاضوں کو ملاحظہ رکھتے ہوئے اردو شعرا، کے تعارف کے لئے اردو زبان استعمال کی گئی ہے۔ الطاف فاطمہ ان کے تذکرہ نویسی میں دلی جذبات کی شمولیت کا ذکر کرنے کے بعد <sup>لکھتی</sup> ہیں:

”غرض کہ ان کے اس نوع کی شخصیت نگاری اور تصویر کشی سے ان کے موضوعات کی زندگی کے مختلف راستے ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور اس طرح پہلی مرتبہ اردو میں ہم کو سوانح نگاری کے موضوع کے ساتھ جذبات اور خلوص کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔“

مؤخر الذکر دنوں تذکروں کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو تذکرہ نگاری بھی ان اثرات کو قبول کر رہی تھی جوفورث ولیم کالج میں اردونشر پر پڑھ رہے تھے یعنی دوسری اصناف ادب کے علاوہ اردو تذکرہ نگاری کی جزویں مضبوط اور مستحکم ہوئی جا رہی تھیں اور اس کے لئے تحقیق و تفصیل کے راستے کھلتے جا رہے تھے۔ اب قدیم تذکروں کے نقصان کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی تھی۔ یہاں پہنچ کر الطاف فاطمہ نے بحیثیت مجموعی تذکروں کی تین فرمیں کی ہیں:

۱۔ وہ تذکرے جو تاریخی رجحان کے ماتحت لکھے گئے۔

۲۔ زبان اردو کی امکانی تحقیق سے متعلق تذکرے جن میں علاوہ اسانياتی تحقیق کے مختلف ادوار میں مختلف اصناف مختصر کی ترقی کے اسباب اور فن تذکرہ نویسی کی تنقید پر زور دیا گیا ہے۔

۳۔ وہ تذکرے جن کو ادبی تاریخ کے قالب میں ڈھانے کی کوشش کی گئی ہے اور جن کے رجحانات کے آمینہ دار مولا نامحمد حسین آزاد کی ”آب حیات“ ہے۔ ابھی اردو تذکرے ان نئے رجحانات و اثرات کو ڈرڈر کر اپناہی رہے تھے

۱۔ آنے الطاف فاطمہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۶۹۔

۲۔ آنے الطاف فاطمہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۷۰۔

کہ اردو کے ماہی ناز انشا پرداز محمد حسین آزاد کے قلمی جادو نے سارے شہہات کو رفع کر دیا اور ۱۸۸۰ء میں ان کی تصنیف آب حیات نے اعلان کر دیا کہ وہ رجھانا ت جوار وہ تذکروں میں پیدا ہو رہے تھے اب امر مسلم اور مستقل طرز بن چکے ہیں۔ آب حیات نے جوار وہ تذکروں کی آخری کڑی ہے، تذکرہ نگاری کی دنیا میں بالپھل پیدا کر دی۔ اس کتاب کو مصنف نے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کے بعض نمائندہ شاعروں پر اپنی ساری توجہ صرف کی ہے۔ ان میں سے بعض کو بعض سے موازنہ کر کے اپنا زور طبع دکھایا ہے۔ پہلے دو دور مختصر ہیں۔ تیرتے دور سے مصنف کا اصل کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اس دور میں میر و سودا کو تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اطائف و ظراائف کی آرائش کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چوتھے دور میں انشاء، ناخ، مصحفی، جرأت، آتش کا بڑا لچک پ بیان ہے۔ پانچویں دور میں آزاد نے اپنے پوری فن کاری دکھادی ہے۔ تفصیل کے ساتھ اس میں اطائف و ظراائف کی چاشنی بھی ہے۔ اپنے استاد ذوق کے افسلی ذکر میں تقریباً پچاس صفحات صرف کئے ہیں۔ اپنے استاد کی تعریف کو اپنے معاصرین غالباً، مومن کے مقابلے میں مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا طرز اسلوب ہے۔ انہوں نے اپنے شگفتہ اور جاندار طرز بیان کی مدد سے اشخاص کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کر دیں۔ ان کے اطائف و ظراائف مزے مزے کی کیفیات پیدا کر دیتے ہیں۔ میر کا استغراق، بلند نظری، فناعت پسندی اور نازک مزا جی، سودا کی معاصرین سے نوک جھونک، مصحفی اور انشاء کے معرب کے، انشاء کی ظرافت اور عبر تناک حالات، ناخ کی رنگت اور جسامت، دریش اور پُر خوری، آتش کی نوک جھونک اور قرابتیں، ذوق کی محیت اور غالب کی خوش طبعی وغیرہ کا بیان قاری کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر کے ذکر کئے جا رہے شاعر کی صحبت میں شریک کر دیتا ہے۔ ان کے تخلیل اور انوکھے طرز بیان کے امتزاج نے مرقوں کو ہمارے سامنے مجسموں کی شکل دے دی ہے۔ لیکن سوانحی اصول کے پیش نظر ہمیں اس میں یہ خامی نظر آتی ہے کہ آزاد نے تصویریوں میں رنگ بھرتے بھرتے حقیقت کو افسانے اور تخلیل کی دنیا بنا کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً میر تھی میر کے حالات اور

مزاج کے سلسلے میں ان کا لکھنؤ میں وارد ہوتے ہی مشاعرے میں شرکت کرنا اور پھر اپنے لکھنؤ کا ان کی وضع قطع پر ہنس ہنس کر ان کی تعریف اور وطنیت کے متعلق استفسار، یہ واقعہ بڑے پراشر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے لباس اور وضع کی ایسی اچھی تفصیل ہی ہے کہ میر صاحب اور ان کے زمانے کے لباس کا بڑا واضح اتصور ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن جدید تحقیق کے مطابق یہ واقعہ بے بنیاد ثابت ہوا ہے۔

اگرچہ آب حیات کا بنیادی مقصد تاریخ ادب کو پیش کرنا تھا لیکن اس میں شخصیت نگاری کے عناصر اس درجہ صحت مندانہ صورت میں ملتے ہیں کہ ہم اس کو قدیم و جدید سیرت اور شخصیت نگاری کی عبوری کثری کہہ سکتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں میں آزاد کو پہلی دفعہ اس لفظ کا احساس ہوا کہ قدیم سوانحی تصنیفات میں ناموروں کی سرگزشت حقائق کی روشنی میں نہیں لکھی گئی۔ چنانچہ آزاد نے اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ خوب جھیل تھیں آفرینی کا شکار ہوئے ہیں۔

غرض یہ کہ محمد حسین آزاد نے تمام شراء کے حالات زندگی اور مرفقاوں کو کچھ تو اپنی معلومات کے سہارے اور کچھ اپنے زور قلم اور تھیل کے بھروسے پر بڑے دل نشین اور افصیلی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ”آب حیات“ نے تو سوانح نگارانہ مقاصد کے پیش نظر لکھی گئی تھی اور نہ ہی ہم اسے سوانح میں شمار کر سکتے ہیں پھر بھی اس میں جو کچھ ہے اس کی بدلت ہم اسے قدیم و جدید طرز سوانح نگاری کی درمیانی کریں کہہ سکتے ہیں۔

تذکروں کے علاوہ اس دور میں ہمیں متعدد ایسی تصنیفات ملتی ہیں جن میں سوانحی عناصر یا جزئیات کا فرمائیں ہیں مگر انہیں سوانح کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے مثلاً مجلس رنگیں از سعادت یارخان رنگیں، ترجمہ تاریخ الخلفاء، خیاء الابصار، دوازدہ مجلس، سیرت رسول مقبول، تذکرۃ الکاملین، روضۃ الاصفیاء، مثنوی قصہ عبرت و مزمی و حشت، عجائب القصص، مغازی الصادقة، عزانامہ سعود، تذکرہ غوثیہ، تواریخ تعلقدار ان اودھ، سفیر اودھ۔ ان کا الگ الگ ذکر نامناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ بے جا موضوع میں طوالت کا باعث ہو گا۔

سوانح نگاری کے ارتقاء میں اوپر ہم نے عربی فارسی تصانیف کے علاوہ وکنی مشتیوں، سیر رجال و شہاں، تو زکوں، شعراءِ اردو کے فارسی اردو تذکروں اور تخلیقات کا ذکر کیا۔ ان سب میں کم و بیش سوانحی عنانصر پائے جاتے ہیں جن سے ہمیں سوانح کے ارتقائی منازل کا پتہ چلتا ہے۔ درحقیقت یہ پورا دور مشرقی طرز سوانح نگاری کا نمونہ ہے اور اس میں شاذ و نادر ہی کہیں مغربی اثر ملتا ہے۔ سید عبد اللہ کے بقول:

”سوانحی اعتبار سے اس زمانے کا قابل ذکر سرمایہ تذکروں سے عبارت ہے اور تذکروں سے الگ صحیح معنی میں سوانح عمریاں لکھنے کا راوج جدید مغربی اثرات کا رہیں منت ہے۔“<sup>۱</sup>

اس اقتباس سے یہ نتیجہ نکالنے میں دیر نہیں لگتی کہ اردو سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز مغربی خیالات کے اثر سے ہوا جس کا سہرا حالی اور شبلی کے سر جاتا ہے۔ یہ اثر اردو کی ابتدائی سوانح نگاری کو کیا رنگ دیتا ہے اس سلسلے میں سید عبد اللہ ایک تاریخی جائزہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”مغربی اثرات کے نفوذ کے بعد اردو میں سوانح نگاری کی ابتدائی کوششوں میں کسی حد تک مناظر انہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ستھویں اور اٹھارویں صدی میں عیسائیوں کی شبلیغی کوششوں کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ حضرت رسول کریمؐ اور اسلام کے مقدس نام آوروں کی سوانح عمریاں لکھ کر اسلام کی حقانیت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ عیسائیوں تک محدود نہ تھا۔ اس میں بھی بھی ہندو مورخ بھی شریک ہو جاتے تھے۔ اس زمانے کی عیسائی اور ہندو تاریخ نگاری کی اصل روح بھی یہی ہے۔ اس کا عمل یہ ہوا کہ مسلمانوں میں تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کی ایک جوابی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ سید احمد خاں کی کتاب ”خطبات احمدیہ“ بھی اس سلسلے کی

<sup>۱</sup> سید عبد اللہ۔ سر سید اوران کے نامور فقائد، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۹۵

ایک کڑی ہے۔ سر سید کے زمانے کے اکثر مورخ اور سوانح نگار ان اثرات سے متاثر ہوئے۔ مولوی چراغ علی کے دور سالے ”لبی لبی باجرہ“ اور ”ماریہ قبطیہ“ اور مولی نذری احمد کی کتاب ”امہات الدّمَه“ انہیں مناظروں کی فضائی مخلوق ہے تاہم سر سید کے دور کے سب سے بڑے سوانح نگار شبلی اور حائل کی تصانیف میں فتنی محاسن بھی موجود ہیں۔<sup>۱</sup>

حالی جدید اردو سوانح نگاری کے موجود قرار دئے جاسکتے ہیں کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے جدید اردو سوانح نگاری کو تذکرہ کی روشن سے آزاد کیا۔ ان کی پہلی سوانح عمری کی کتاب حیات سعدی ۱۸۸۲ء کا دیباچہ گویا اردو سوانح نگاری کا منشور ہے۔ اس میں انہوں نے یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے یہاں سوانح نگاری کی ابتداء ارتقاء پر اظہار خیال کیا ہے۔ از منہ و سطی میں یہ سائیوں کے اولیاء، شہدا اور مجتهدین کے تذکروں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ ستر ھویں صدی سے انگلستان میں سوانح نگاری کی ابتداء اور ترقی ہوئی اور انیسویں صدی میں کئی جلدیوں میں مشاہیر کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی۔ حتیٰ کہ تاریخ کی طرح سوانح نگاری نے بھی فلسفے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے مشرقی سوانح نگاری میں سوائے رجال حدیث کے اوروں کے حال میں درایت کے بجائے محض روایت پر عمل ہونے نیز فارسی میں سوائے تاریخی شخصیتوں کے مثلاً سلاطین، وزرا، امرا وغیرہ کے کسی اہل کمال کی کوئی مستغل سوانح عمری نہ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ حالی نے اس دیباچے میں سوانح نگاری کے اخلاقی فائدوں اور اس کے علم الاحراق سے مقابلے وغیرہ کے بعد اس کی یادگاری خصوصیات پر زور دیا ہے۔ حالی کو زبان پر اس قدر گرفت تھی کہ انہوں نے محض پانچ صفحات میں یہ سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ نیز انہوں نے ”حیات سعدی“ کے مانحوذات کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے یوگر لفی کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کی پوری وضاحت ہو سکتی ہے:

۱۔ سید عبد اللہ۔ میر امن سے عبد الحق تک، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۸۔ ۱۳۷۸ء

”بیوگر اینی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنہوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جوانان کی آئندہ نسلوں کے لئے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنا میں چھوڑ گئے ہیں خصوصاً جو قومیں کے علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجے کو پہونچ جاتی ہیں، ان کے لئے بیوگر اینی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رُگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انگستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے: ”بیوگر اینی چلا چلا کراور مندر کے طوفان کے طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔“

حیات سعدی کو مصنف نے دو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور آخر میں خاتمه ہے۔ پہلے باب میں شیخ سعدی کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں ان کی تصوفیات کا مفصل ذکر ہے۔ خاتمے میں ان کے عام حالات اور شاعری پر بالا جمالي نظرڈالی گئی ہے۔ حالی نے سعدی کی شہرت و مقبولیت کے پیش نظر ان کی حیات قلم بند کرنے کا ارادہ تو کر لیا تھا لیکن انہیں اس کے لیے مواد کی کمیابی پر سخت مایوسی ہوئی۔ یہ انہیں کی ہمت اور حوصلہ مندی تھی کہ مختلف جگہوں سے خوش چینی کر کے اور اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ایک ایسی سوانح عمری مرتب کی کہ شبلی جیسے سخت اتفاقوں کو بھی اس کے ولچپ محققانہ اور اور بے مثل سوانح عمری ہونے کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سعدی کی کلیات میں ہزلیات و مضحکات بھی ہیں جو ان کے کلام کے بد نماداغ ہیں لیکن حالی نے سعدی کو اس کا ذمہ دار نہیں تھہرا�ا ہے۔ دراصل سعدی نے اس سلسلے میں مجموع

ہزلیات کے شروع میں چند سطحیں معدودت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں کہ ان کو اس کے لئے ایک بادشاہزادے نے مجبور کر دیا تھا چنانچہ انہیں اس کی بات ماننی پڑی۔ عبارت کے آخر میں انہوں نے اس غلطی پر ناداں ہو کر خدا سے مغفرت بھی مانگی ہے۔ غرض حالی نے سعدی کے اس عذر کو قرین قیاس مانا ہے اس لئے ان پر اعتراض کی کسی بھی کوشش کو بے جا قرار دیا ہے۔

بہر حال حیات سعدی کی اہمیت اس لحاظ سے مسلم ہے کہ حالی نے سب سے پہلے جدید سوانح نگاری کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ہیرود کے مزاج، اخلاق و عادات، کردار پر سماجی احوال اور بیرونی مناظر کا اثر دکھایا ہے اور بتایا ہے کہ شیراز اور فارس کی عالم فضا کیا تھی جس نے ہیرود کی شخصیت پر اپنا اثر ڈالا۔ طبعی اثرات کا نظر یہ حالی نے اردو میں سب سے پہلے پیش کیا۔ اس سوانح عمری کے مطالعہ سے مجموعی طور پر سعدی کے بچپن، تعلیم و تربیت، جوانی، سیر و سیاحت، دانشمندی اور سلیم اطباعی جیسے اوصاف نیزان کی شاعری کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔

مولانا حالی کی ترتیب شدہ دوسری سوانح عمری یادگار غالب (۱۸۹۷ء) ہے۔ اس کی عظمت کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ غالب کے مطالعے کے لیے اس کتاب کو نظر انداز کرنا گویا مطالعے میں بے تو جھی کا اظہار کرنا ہے۔ حالی نے اپنی ذاتی واقفیت (کیونکہ ان کے ہم عصر اور استاذ تھے) اور غالب کے دوستوں و رشتہ داروں وغیرہ کی معلومات، ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ لگانے کے علاوہ ان کی تصانیف کو اکٹھا کر کے ان سے بھی ان کے حالات اخذ کئے ہیں۔ حالی نے ان کی تصنیفات سے اقتباسات کے علاوہ ان کے کلام کے انتخاب اور اس کی تشریح سے ان کے کردار کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے غالب کی شخصیت میں زندہ ولی اور شگفتگی جیسے اوصاف پر زور دیا ہے کیونکہ ان کے پیش نظر ابھی سوانح عمری کا مقصد صرف اصلاحی اور قوم میں جوش ولوہ پیدا کرنا تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنی پہلی دونوں سوانح عمریوں میں ہیرود کی خامیوں کو نظر انداز کیا ہے۔ حالی کے نزدیک ان کے زمانے کو دیکھتے ہوئے یہی معیار مناسب تھا۔ ”یادگار غالب“ کی

اہمیت کو شیخ چاند کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

”یادگار غالب میں حالی نے غالب کے سوانح حیات جس ترتیب و تبویث کے ساتھ قلم بند کئے ہیں اور واقعات کے انبار سے جو مطلب اور کام کی ضروری باتیں یکجا سلیقے سے جمع کردی ہیں وہ ان کی قوت استادی اور دماغی و عقلی سنجیدگی کی دلیل ہے۔ وہ واقعات کے گھوم سے گھبرا تے نہیں ہیں بلکہ نہایت استقلال اور خاطر جمعی سے ان گوناگون اور مختلف و متنازع و متعینوں کے حالات و واقعات کو قابو میں لا کر قلم بند کرتے ہیں۔“

حالی کے قلم سے نکلی ہوئی تیری اور آخری سوانح ”حیات جاویدہ“ ہے۔ یہ تیرے باب میں ہمارا اصل موضوع بحث ہے لہذا یہاں اس کے ذکر سے بے جا طوالت ہو گی۔ حالی کی تصنیف کردہ ان تینوں سوانح عمریوں کے بارے میں سید احتشام حسین اپنی بیش قیمت رائے پیش کرتے ہیں:

”حالی کی لکھی ہوئی تین سوانح عمریاں اردو ادب کے خزانے میں بے بہا جواہر ہیں جنہیں پر کھنا آسان نہیں ہے۔ ان میں مواد کی ترتیب اور انشاء پردازی کا حسین امترانج ہے۔ موضوع کا انتخاب مصنف کی شخصیت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ حالی اگر اخلاق کی مخصوص قدروں کے علم بردار نہ تھے تو کچھ بھی نہ تھے اس لئے گلستان بوستان کے مصنف شیخ سعدی کی سوانح عمری لکھ کر انہوں نے اپنی اس خواہش کو تسلیم دی جو اخلاق کے نظام کو استوار رکھنا چاہتی تھی۔ یادگار غالب کے نام سے اپنے استاد کے سوانح حیات قلم بند کئے اور شعروشاعری کے اہم نکات کے پردے میں اس دور کے ایک معمولی انسان کی زندگی کے نقش ابھارے۔ حالی عمل کے میدان میں سر سید کے لفظ لفظ سے متفق تھے۔ اس لئے

حیات جاوید صرف سرید کی زندگی کا خاکہ نہیں ہے بلکہ اس جدوجہد کی تغیر ہے جو نئی زندگی کے مطالبوں کی شکل میں پیدا ہو رہی تھی اور قدامت پرست جن کی مخالفت کر رہے تھے۔<sup>۱</sup>

اک دوسرے دوسرے عظیم اور اہم سوانح نگارشلبی ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں کے موضوع عموماً تاریخی اور مذہبی ہیں۔ ان کی سوانحی تصانیف میں المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرت النبی کے نام لیے جاتے ہیں۔ ہم یہاں ان کا ذکر اسی حد تک کریں گے جو ہمارے لئے سوانح نگاری کا ارتقاء دکھانے میں معاون ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر تفصیل چاہتا ہے جس کے لئے ہمیں ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہوگی۔

المامون (۱۸۸۹ء) دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مامون رشید کی ولادت، تعلیم و تربیت، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور وفات تک سارے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصے سے ملکی حالات اور مامون کے تمام اخلاق و عادات کا اندازہ ہوتا ہے۔ المامون کی تصنیف سے مصنف کا مقصد سوانح نگاری نہیں تھا بلکہ دراصل وہ مامون رشید کی تاریخ پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ہم کو سوانح کی جملکیاں نظر آتی ہیں۔ ہم کو اس سے مامون کے عبده تاریخ، خانہ جنگیوں اور سیاسی واقعات کا سیرت کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ شبی نے محنت سے تاریخی واقعات اور شوابہ کی تلاش کی ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کا مرقد دیانتدار ان طریقے پر پیش کرنا چاہتے تھے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

شبی کی دوسری تصنیف سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء) میں سوانح نگاری کا پہلو نہایاں ہے۔ یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ امام ابو حنیفہ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس تصنیف میں شبی نے انہیں باتوں اور واقعات پر زور دیا ہے جو عقل و ادراک کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ محض خوش اعتقادی سے پیدا شدہ واقعات پر زور نہیں دیا۔ عقیدت و محبت کے باوجود مصنف

نے فن سوانح نگاری کے تقاضوں کے پیش نظر شخصیت کو مسخ نہیں ہونے دیا۔

الفاروق (۱۸۹۸ء) شبلی کی اہم سوانحی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اپنے مواد کی تشكیل، سوانح نگارانہ تکنیک اور مصنف کی ذاتی دلچسپی کے لحاظ سے نمایاں فوقيت کھجتی ہے۔ اس کے مواد کے حصول کے لئے انہوں نے روم و شام کا بھی سفر کیا۔ اس کتاب کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں بحیثیت سوانح نگار، بیرو کے حالات اور سیاسی رجحانات کے ساتھ اس عہد کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کو پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ حصہ دوم میں حضرت عمرؓ کے تمام ملکی، مالی اور فوجی انتظامات کی تفصیل ہے۔ اخلاق و عادات اور خصوصاً مذہبی اجتہادات کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اس تصنیف میں شبلی کا فتنی شعور درجہ کمال پر نظر آتا ہے۔ بلاشبہ یہ مولانا شبلی کی اور اردو ادب و سوانح نگاری کی بہترین تصنیف میں شمار کی جاسکتی ہے۔

الغزالی (۱۹۰۲ء) بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ حیات سے متعلق ہے جو نہایت مختصر ہے۔ حصہ دوم میں امام غزالی کی تصنیفات پر تبصرہ ہے۔ کتاب کے مطلع سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا بلکہ علماء کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق ایک خاص سطح پر لانا تھا۔ پھر بھی شبلی نے موئے موئے واقعات کو اس طرح پیش کر دیا ہے کہ اس پر ان کی سوانح نگاری کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

”سوانح مولانا روم“ (۱۹۰۲ء)، ”الغزالی“ کے بعد شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے نام و نسب، تعلیم و تربیت، شادی، اولاد، وفات وغیرہ کا مذکورہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ دوسرا حصہ میں مولانا رومی کی تصنیفات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان کی مثنوی کوششی نے علم الکلام کے ایک شاہکار کا درجہ دیا اور یہی شبلی کا اصل مقصد ہے۔

سیرت النبی (۱۹۱۰ء) شبلی کی آخری اور ایک شاہکار تصنیف ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ جاویدہ تصنیف ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ شبلی نے صرف اس کی دو جلدیں ہی لکھی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ باقی چار جلدیں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے ترتیب دیں۔ شبلی نے ابتدائی دونوں جلدیوں میں حضور

اکرمؐ کی شخصیت کی بشری خصوصیات کا مرقع اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کتاب کو اردو ادب کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بشری کمزوری کی پردوہ پوشی کرنے کی کوشش نہیں کی ہے گویا انہوں نے آنحضرتؐ کے سوانح حیات کو جدید رنگ میں پیش کیا ہے۔

حالی کے عہد میں شاید حالی کے علاوه جن لوگوں نے سوانح عمریاں لکھیں ان میں ذکاء اللہ، نذری احمد، چراغ علی اور عبدالحیم شریر کے نام اہم ہیں۔ سر سید احمد کی تخلیقات سیرت فرید یہ، آثار الصنادید اور خطبات احمد یہ میں بھی سوانحی مواد ملتا ہے۔ سیرت فرید یہ میں سر سید نے اپنے نانا فرید الدین کے حالات لکھے ہیں۔ آثار الصنادید کے چوتھے باب میں چند مشاہیر و بلی کے احوال کا بیان ملتا ہے۔ خطبات احمد یہ کے بارہوں خطبے میں حضورؐ کے بارہ سال کی عمر تک کے حالات قلم بند ہیں گویا سر سید نے ان تصنیفات کے ذریعے غیر شعوری طور پر سوانح نگاری کے ارتقا، میں مدد کی ہے۔ لیکن ان مصنفین کی سوانحی تصنیفات میں جدید اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ ذکاء اللہ کا سارا سوانحی کام ملکہ و کنوریہ اور شہزادہ البرٹ کی لاکن تک محدود ہے۔ نذری احمد اور چراغ علی کی سوانح عمریاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں اس لئے کہ یہ مخفی مناظرانہ ہیں۔ البتہ عبدالحیم شریر کی سوانح عمریاں، خاکے اور مرقعے اس نقطہ نظر سے ضرور قابل توجہ ہیں کہ ان میں مصنف کی سوانحی نظر اور شخصی جزئیات پر زیادہ زور ہے اور نصب العین بھی سوانح ہے۔ اگر دوسرا مقصد ہے بھی تو وہ ثانوی اور قسمی ہے۔ لیکن بہر حال وہ خالص سوانح نگار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کو تاریخی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اپنے سوانحی خاکوں میں انہوں نے ناول کی دلکشی اور حسن کو سمودیا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں شررنے چھوٹی چھوٹی سوانحی تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان میں جنید بغدادی، لارڈ بیکن، ابو بکر، شبلی، سکینہ بن حسین، خوبیہ معین الدین چشتی، سوانح عمری رستم تهمتن اور عائشہ صدیقہ ضمائل ذکر ہیں۔ ان کے موضوعات تاریخی اور علمی ہیں۔ اس طرح سوانح نگاری اس دور میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور ادب میں اپنے مختلف ترقیاتی نقوش چھوڑتی ہے۔

## باب سوم

# حالی کی سوانح نگاری کا تنقیدی جائزہ

## حیات جاوید کی روشنی میں

فن سوانح نگاری کی بحث کے ذیل میں یہ بات آچکی ہے کہ کسی سوانح کے موثر یا غیر موثر ہونے میں سوانح نگار کی شخصیت کا سب سے زیاد وہ اہم رول ہوتا ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیات جاوید کی روشنی میں حالی کی سوانحی کا رکرودگی کی بحث سے قبل حالی کی شخصیت کا مختصر آجائوزہ لیا جائے۔ آگے چل کر اس کی روشنی میں ہم یہ دیکھیں گے کہ کیا واقعی حالی نے سر سید جیسی عظیم شخصیت کی سوانح نگاری کا حق سوانح نگاری کے اصولوں کے تحت ادا کیا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں حالی کی سیرت اور ان کی خدمات اور سر سید سے ان کے تعلقات، میں صحیح نتائج تک پہنچانے کا کام کریں گے۔

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت میں ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ میں ان کی پرورش ہوتی۔ ان کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چنانچہ انہوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ حفظ قرآن کے بعد فارسی کی تحوزی سی تعلیم سید جعفر علی سے حاصل کی جو فارسی کے بہت اچھے ادیب اور سخن فہم سمجھے جاتے تھے۔ فارسی کے ساتھ انہوں نے عربی صرف و نحو پڑھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی تعلیم کو تمکیل کے درجے تک پہنچا میں لیکن ۷۰ برس کی عمر میں حالی کی شادی کر دی گئی اور بظاہر ان کی تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔

مگر علم کی پیاس ان کو دلی لے آئی۔ وہاں کچھ صرف اور نخوا اور ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں۔ غالب کی صحبت بھی وہیں ان کو ملی۔ شاعری کا فطری جوہر ان کے اندر جب غالب نے دیکھا تو کہا،

”اگر چہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری  
نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کھو گے تو اپنی طبیعت پر سخت  
ظلم کرو گے ।“

ظاہر ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس  
نے یہ بات کچھ دیکھ کر اور کچھ سمجھ کر کبھی ہو گی۔

بزرگوں اور عزیزوں کے جرستے حالی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانی پت  
اپس جانا پڑا۔ حصار میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل ہو گئے مگر ۱۸۵۱ء کی  
ہدایتی میں گھر چلے آئے۔ قریب تھے برس تک وہیں رہ کر بغیر کسی ترتیب اور نظام کے  
بھی منطق یا فلسفہ، بھی حدیث، بھی فسیر پڑھتے رہے۔

ایک بار پھر حالی تلاش معاش میں دلی آئے۔ یہاں ان کی ملاقات نواب  
مصطفی خان شیفۃ سے ہو گئی۔ انہوں نے حالی کو تقریباً آٹھ سال تک اپنے ساتھ بڑی  
شفقت و محبت کے ساتھ رکھا۔ اس صحبت سے حالی کی شاعری چمک اٹھی۔ غالب سے  
حالی کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا نواب صاحب کی صحبت سے۔ وہ مبالغے کو ناپسند  
کرتے اور سیدھی پچی بالتوں کو محض حسن بیان سے ولغیری بنا نا اسی کو منہماً کمال  
شاعری سمجھتے تھے۔ اس کا اثر حالی پر بھی ہوا جس کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

۱۸۶۹ء میں ہی غالب کے بعد شیفۃ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس مرتبہ لاہور  
میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انہیں ایک جگہ مل گئی۔ یہاں ان کے ذمے یہ کام تھا  
کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں ان کی عبارت درست کر دیا کریں۔ لاہور  
کے اس چار برس کے قیام نے حالی کے مذاق ادب اور مذاق شعر کو بہت کچھ بدلا اور  
اس بہانے قدرت نے انگریزی نہ پڑھ سکنے کی کمی پوری دی۔ انگریزی کتابوں کے

ترجموں پر نظر ڈالنے سے وہ انگریزی زبان و ادب کی بہت سی کتابوں کے مطالب سے واقف ہو گئے۔ اب انہیں ادب کے صحیح مقام کا اندازہ ہوا۔ مغربی ادب سے انکی دلچسپی بڑھنے لگی اور روز بروزان کی نظروں میں مشرقی لشیخ خاص کر فارسی لشیخ کی، جس سے اب تک انہیں بہت لگا تو تھا، وقعت کم ہونے لگی۔ ان پر نہ صرف مغربی ادب کا گہرا اثر پڑا بلکہ انگریزی زبان سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنی نشر میں انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ حیات جاوید میں انگریزی الفاظ کا جا بجا استعمال بھی اسی کا مظہر ہے۔

۱۸۷۴ء میں ولی آنے کے بعد حالی کے دل پر انتہائی مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک نئی ابحاث اور ذہنی کشکش میں مبتلا تھے۔ نوجوانی کا دور گزر چکا تھا۔ عشقیہ شاعری کا دلوں سرد ہو گیا تھا۔ اب بجائے عشق کے روگ کے قوم کا دردان کو ستارہ باتھا۔ ملک اور قوم کی زبوں حالی نے ان کے درد آشنا اور حساس دل پر بہت اثر ڈالا۔ انہیں اپنا ۲۰-۲۲ سال کا سرمایہ شعر بالکل بے قدر نظر آرہا تھا۔ کسی برتر اور اعلیٰ کام کا دلوں ان کے دل میں ابھر رہا تھا۔ شعر و ادب میں اصلاح، قوم کو ابھارنے کا جذبہ، انسانوں کو انسان بنانے کی تمنا غرض مختلف جذبات تھے جو ان کے دل میں موجز ن تھے مگر ابھی تک انہیں صحیح راستے کا علم نہ ہوا کہا تھا۔ انہیں حالات میں حالی کی ملاقات سر سید سے ہوئی۔ حالی ان کی زبردست شخصیت، ان کی مضبوط سیرت اور سب سے زیادہ ان کے بلند مقصد سے بے حد متاثر ہوئے اور دل و جان سے سر سید کی ساتھ ہو گئے۔ اس طرح حالی کی ڈوبتی بیٹا کو کنارا مل گیا۔

سر سید نے حالی کے دل پر جادو کا سا اثر کیا۔ سر سید ہی کے اشارے پر انہوں نے مشہور و معروف نظم ”مسدح حالی“، لکھی جو آج بھی ادب میں ایک مخصوص مقام رکھتی ہے۔ اس نظم کی سر سید نے بہت تعریف کی اور اسے آخرت میں اپنی نجات کا ذریعہ بتایا۔ اب حالی کی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی۔ وہ تصنیف و تالیف کے کام میں کافی وقت صرف کرتے رہے۔

اب ایک نظر حالی کی سیرت و اخلاق پر بھی ڈالتے ہیں۔ سید عابد حسین اپنے

مضمون "حالی" میں لکھتے ہیں:

"ایک سن رسیدہ عالم شاعر، حق پرست، حق گو، صاف دل، پاک  
باطن، حکیم، مفکر، خوددار، غیرت مند، محبت کا پتا، اخلاق کا مجسم،  
دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا ہمدرد، پانی پت  
میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے۔ اس کی زندگی  
خدمت کے لئے وقف ہے..... یہ شخص سب کی فرماش  
پوری کرتا ہے۔ سب کو جواب دیتا ہے اور اس بخزا انگسار کے  
ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ کوئی تعریف  
کرے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ بجا اعتراض ہو تسلیم کر لیتا ہے، بے  
جا اعتراض ہو چپ ہو رہتا ہے۔ دشمن پھیتیاں کتے ہیں،  
گالیاں دیتے ہیں یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ دوستوں میں  
سے کوئی جواب دینا چاہے تو اسے منع کر دیتا ہے۔ بعض وحد  
کے بادل برستے رہتے ہیں اور برس کر چلے جاتے ہیں۔ حلم کا  
دریا بہتا چلا جاتا ہے۔"

ان بے شمار صفات کا ایک انسان میں یکجا ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ ان  
کے استغنا اور قناعت کی ایک مثال ایسی ہے جس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں شاید  
ہی ملے۔ انہوں نے اپنی تصانیف سے کبھی مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کا اصول تھا کہ جو  
کتاب قوم کی اصلاح کی غرض سے لکھی جائے اسے کسی شخص کی ملکیت نہیں ہونی  
چاہیے۔ اسی لئے انہوں نے ایک دو کتاب کے سوا باقی مشہور تصانیف کی رجسٹری نہیں  
کرائی اور نہ حق تصنیف لیا۔ حالی کو شہرت اور نام و نمود کی بھی طلب نہیں تھی۔ وہ اس  
حقیقت کو جانتے تھے کہ جسے شہرت و نمود کی چاٹ لگ جائے وہ قوم کی بھوس اور پھی  
خدمت نہیں کر سکتا۔ مولا نا محمد علی کے بقول:

"اگر حیات جاوید اور مسدس حالی کا مصنف شہرت پسند ہوتا اور

کب شہرت کرتا تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نام دنیاوی اور مادی نقطہ نظر سے بہت بلند ہوتا لیکن اس نے بھی بازار میں بکنا گوارانیں کیا اور مولانا حالی کا یہ امتیازی کیریکٹر ہماری قوم میں بہت ہی کم نظر آتا ہے۔<sup>۱</sup>

حالی کی خاکساری و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ بقول مولوی عبدالحق:

”انہوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ مرتبہ لکھا، بھی مؤلفہ یا مصنفہ، کافظ نہ لکھائے۔“<sup>۲</sup>

حالی میں اپنے ہم عصروں سے بھی رشک و رقبت کا جذبہ نہ تھا۔ ان کے بعض ہم عصر ان کی غیر معمولی علمی اور ادبی قابلیت اور عزت پر بڑا رشک کرتے تھے اور بعض تو اس رشک کو چھپا بھی نہیں سکے۔ لیکن مولانا حالی کے دل میں اپنے ہم عصروں اور ادیبوں کی بڑی عزت تھی اور وہ کھلے دل سے ان کی تعریف اور حوصلہ افزائیاں کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر جو روایویں لکھے ہیں ان میں علمی دیانت اور صدق دل کے ساتھ ان کی خوبیوں کو سراہا ہے۔

سر سید کی طرح حالی بھی رسوم و توهہات کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے زہر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام کو اس روایتی قید اور بے جا بندشوں سے نہ آزاد کیا گیا تو تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بیزار اور روگرداں ہو جائے گا۔ اس موضوع پر حالی نے ”حیات جاوید“ اور دیگر دو تین مضمایں میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ سر سید کو برخلاف اس وقت کے عالموں اور مذہب پرستوں کے سچا مسلمان، اسلام کا شیدائی اور مسلمانوں کا رہنمای سمجھتے تھے اور باوجود بعض باتوں میں ان سے اختلاف رکھنے کے ان کے ان مذہبی اصلاحوں کے بڑے قدر دان تھے جو سر سید کر رہے تھے۔ سر سید اور حالی کی کوششوں کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مسلمان ذلت سے نکلیں اور ان میں اپنی پستی کا احساس

۱۔ صالح عابد حسین۔ یادگار حالی، علی گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۷۲

۲۔ مولوی عبدالحق، چند ہم عصر، کراچی ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۶

ہو۔ افادیت اور مقصدیت پر اس قدر زور دینے سے حالی کے بعض خیالات کو ہنگامی خیال کیا گیا حالانکہ حالی کا مقصد قومی خیرخواہی تھا اور اس سلسلے میں انہیں جہاں سے بھی مغاید خیالات ملے انہوں نے قبول کئے۔

۱۸۵۰ء کے انقلاب نے حالی کی ذہنی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا تھا اور اصلاح معاشرت و ادب کی فکر ان کو ستانے لگی تھی لیکن ان میں کوئی واضح تصور اس وقت تک نہیں ابھر سکا جب تک ان کی سر سید سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تحریک سے ذہنی ہم آہنگی کے بعد حالی کے ذہن کا رخ بدل گیا اور انہوں نے اپنی کاوشوں کو قومی و ملی فلاح کے لئے وقف کر دیا۔ اس سلسلے کی پہلی مستقبل تصنیف ”حیات سعدی“ کے نام سے منتظر عام پر آئی۔ یہ اردو کی پہلی باقاعدہ سوانح عمری ہے جسے طرزِ جدید کی سائنسی فکر بایوگرافی کا اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ معتبر شہادتوں کے مطابق۔ ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی۔ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے اردو میں یہ کتاب سعدی کی شخصیت اور کلام کا بہتر سے بہتر جائز ہے۔ فارسی شعراء میں حالی سب سے زیادہ سعدی سے متاثر تھے اور اگر بغور دیکھا جائے تو حالی اور سعدی میں بہت حد تک ذہنی ممائش ہے۔ فارسی شاعری کے برخلاف سعدی کے انداز بیان میں نمایاں طور پر تحقیقت پسندی اور سادگی ہے۔ حالی اور سعدی دونوں اپنے دور کے مصلح تھے اور دونوں نے اپنی پوری زندگی اخلاقیات کا درس دینے میں گزر دی۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کو ”سعدی ہند“ کہا جاتا ہے۔

حالی کی دوسری سوانح یادگار غالب (۱۸۹۰ء) ہے۔ غالب کے مطالعے کے سلسلے میں اس کتاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گرچہ حالی کے مخصوص نقطہ نظر نے بحیثیت سوانح عمری اس کتاب کی افادی حیثیت کو قدرے محدود کر دیا ہے لیکن یہ کتاب مرزا غالب کے کمالات انشاء پردازی و شاعری کا اچھا تجزیہ ہے۔ خود حالی کے بقول:

”مرزا کی لائف جیسا کہ ہم آئندہ کسی موقعے پر بیان کریں گے، فائدوں سے حالی نہیں ہے جو ایک بیوگرافی سے حاصل ہونے چاہیں لیکن ان فائدوں سے قطع نظر کی جاتی تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور

شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو ہماری پڑ مردہ دل سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

یہاں حالی کی پہلی دونوں سوانح کی کتابوں کے ذکر کا مقصد یہ تھا کہ مجموعی دلیل سے حالی کی سوانح نگاری کی مقصدیت کو صحیح لیا جائے۔ سیاسی زوال اور معاشی انحطاط کی وجہ سے پوری مسلمان قوم میں اضھال کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور ان کی ہمتیں ایسی پست اور عزائم اس قدر پڑ مردہ ہو چکے تھے کہ وہ ہر عملی پروگرام سے محبراتے اور جدوجہد سے گریز کرتے تھے۔ ایسی حالت میں حالی قوم کے لئے عظیم شخصیات کے نمونے پیش کرنا چاہتے تھے۔ افادیت کا یہ پہلو حالی کے ہمیشہ پیش نظر رہا۔

حالی کی زندگی، شخصیت کا مجموعی تاثر، سیرت و اخلاق، دودیگر سوانحوں اور ان کی مقصدیت کو پیش کرنے کے بعد انہیں چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اب ہم حیات جاوید کا فصیلی تعارف اور فن سوانح نگاری کی روشنی میں اس پر تنقیدی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ جس طرح عظیم شخصیات، جن کے اندر رزیادہ اتار چڑھاؤ ہوتے ہیں، کی سوانحوں کی ترتیب میں سوانح نگار کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے پھر بھی وہ تنقید و تعریض کا شکار ہوتا ہے اسی طرح یہ فیصلہ کرنا کہ سوانح نگار نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا یا نہیں خصوصاً اس وقت جب کہ موضوع مختلف فیہ ہو، آسان نہیں ہوتا۔ حیات جاوید کے موضوع بنے سر سید احمد خاں کی شخصیت بھی اپنے دور کی ایک ممتاز شخصیت تھی جس نے مسلم قوم کی ترقی کے لئے مسلسل قربانیاں پیش کیں۔ سر سید نے مسلمانوں کو جوش، جذبہ، ہمت، اور عقل کے حقیقی معنی سمجھائے ورنہ مسلمانوں کی تمام تر توجہ انگریزوں سے نفرت کرنے اور دل ہی دل میں برا بھلا کہنے پر صرف ہورہی تھی۔ یہ شور و غوغاء اپنے اندر نہ کوئی سکت رکھتا تھا اور نہ اس کی مدد سے زندگی میں کسی قدم کی کایا پلٹ کی جاسکتی تھی۔ بلکہ یہ احساس کم تری اور ڈینی انتشار کا سبب بنا ہوا تھا۔ سر سید نے سیاست کا انتہائی پہلو اختیار کر کے مسلمانوں کو زندہ رہنے کا سبق سکھا دیا اور انگریزی علوم ہی کی مدد سے انگریزی سیاست کی کاش کی۔ لوگ حالات کو سطحی طور پر

و بکھر بے تھے، کسی کو حالات کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک عرصے تک مذہبی شعور کے علاوہ کوئی شعور بیدار نہیں تھا۔ سر سید نے حالات کے لحاظ سے ایک خاص شعور کو قوم کے اندر جاگزیں کرنے کی کوشش کی اور اس تحریک کو ایک ایسی ذہنی تحریک بنادیا جس کے اثرات آج تک جاری و ساری ہیں۔

سر سید ایک مختلف الحیثیات شخص تھے۔ انہوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی، تحقیقی۔ غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں نمایاں حصہ لیا۔ تب انہوں نے عمل کے ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا اور ہر جگہ دیرپا اثرات چھوڑے۔ ملکی سیاست میں بھی ان کے کارنامے مسلم ہیں۔ چنانچہ ان کے مخصوص سیاسی خیالات نے ہندوستان کے مسلمانوں کی روشن کو بد لئے میں بڑا رول ادا کیا۔ مخصوص تعلیمی معاملات میں ان کے مخصوص نظریات نے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی صورت اختیار کی اور مذہبیات میں انہوں نے فلکرو تصور کے نئے زاوے پیدا کیئے۔ غرض علم و عمل کے تقریباً ہر شعبے میں انکی انقلاب آفرین شخصیت نے اپنے نقوش ثابت کئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی زندگی سطحیت کے ساتھ نہیں لکھی جا سکتی۔ حالی حیات جاوید کے دیباچہ میں اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

”لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصیب اور جہالت کا مقابلہ کیا، تقلید کی جزو کا ہے، بڑے بڑے علماء و مفسرین کو لتاڑا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے کچھ پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلاتی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدقہ کہا ہے تو دوسرے گروہ نے زندقی کا خطاب دیا اور جس کو پالکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لاگف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے؟“

چنانچہ ایس شخص کی سوانح لکھنے کی ذمہ داری اتنی آسان اور اس کی زندگی کے اختلاف پہلوؤں میں منصفانہ محاکمہ اتنا سہل نہ تھا۔ مشکل یہ تھی کہ شخصیت کے مختلف طویل گوشوں کو سمیتا کیسے جائے۔ پھر حالی کے سامنے اردو سوانح نگاری کے باقاعدہ اصول و ضوابط بھی نہیں تھے۔ لہذا مصنف کے لئے یہ ذمہ داری ایک مشکل ترین امتحان اور آزمائش تھی۔ موضوع اپنے مصنف کی نظر میں جس قدر اہم اور محبوب تھا اتنا ہی اس کو گرفت میں لانا مشکل تھا۔ اس کے باوجود حالی نے یہ بارگراں سر پر اٹھایا اور اس کی ذمہ داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو کر (بعض لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جن سے کوئی بھی انسان بری نہیں ہو سکتا) ایک ایسی یادگار تصنیف چھوڑی ہے جو سوانح نگاری کے فن میں پہلی منظم اور باقاعدہ کتاب کبھی جا سکتی ہے۔ خلیق احمد نظامی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

”اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی سوانح حیات تھی جس کو مغربی طرز پر ترتیب دیا گیا تھا اور تحقیق و تنقید کے اعلیٰ ترین معیار کو سامنے رکھ کر واقعات کی تحقیق کی گئی تھی۔ حیات سعدی میں حالی کے اخلاقی اصول، یادگار غالب میں ان کی ادبی دلچسپیاں اور حیات جاوید میں احیاء ملت کے جذبات صاف دعوت فکر دیتے نظر آتے ہیں۔ حالی کے سب ہیر و اقدار عالیہ کے ترجمان ہیں۔“

تاریخ عالم میں دو طرح کے آدمی زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو کم تر درجے سے ترقی کر کے اعلیٰ درجے پر پہنچتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اعلیٰ درجے سے گر کر تنزلی کی درجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں قسم کے آدمیوں کی حیات میں حرکت اور جنبش پائی جاتی ہے اس وجہ سے ان کی حالت پر ہر شخص متوجہ ہوتا ہے اور ان کی زندگی سے ہر شخص تاثر لیتا ہے چاہے وہ کسی قسم کا ہو۔ دوسری نوعیت کے آدمیوں کی زندگیوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو محض عبرت کے علاوہ کوئی دوسرا تاثر نہیں اخذ کیا جاسکتا مگر پہلی قسم کے آدمیوں کے واقعات و حالات کا جائزہ لینے سے وہ ذرائع معلوم

۱۔ خلیق احمد نظامی۔ اے آنکہ زنور۔۔۔ فکر و نظر سماں ہی حالی نمبر، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۲

ہوتے ہیں جو انہیں بام عردن پر پھو نچاتے ہیں۔ نیز وہ بدایتیں اور نمونے بھی حاصل ہوتے ہیں جن کو اپنا کر ایک ادنی آدمی اعلیٰ درجے تک پھوٹ سکتا ہے یا کم از کم اس کی زندگی میں ثابت تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ لبذا پہلے قسم کی شخصیات کی زندگیاں دوسرے قسم کے آدمیوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ہوتی ہیں اور قومی ترقی و تربیت کے لئے اس قسم کی زندگیاں پیش نظر رکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری قوم کا لڑپھر اس طرح کی سوانح عمریوں سے خالی تھا۔ حالی کے زمانے تک مخفی بعض سلاطین، بعض وزراء اور بعض علماء و مصنفوں جیسے اشخاص کی لائفیں تیار ہوئی تھیں مگر حالات بدل چکے تھے اس لئے حالی نے بادشاہ و امراء وغیرہ کو چھوڑ کر سر سید کو اس لئے چنانکہ ان کی زندگی قوم کے لئے راہ عمل ثابت ہو سکتی تھی۔ دیباچہ حیات جاوید میں حالی بہت واضح انداز میں لکھتے ہیں:

”اگر چہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولو العزم بادشاہ، بڑے بڑے داشمندوز یا اور بڑے بڑے بہادر پہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں مخلوم بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشانی کے لئے درکار ہیں ہمارے لئے بے سود ہو گی۔ ہمارے اسلاف میں حکماء و مصنفوں کی بھی کچھ کمی نہیں ہے مگر وہ آج ہمارے لئے قابل تقلید نہیں بن سکتے ہیں“

حالی کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ سلف صالح کے حالات ہمارے لئے بالکل مفید نہیں ہیں بلکہ آگے چل کر وہ خود چند فوائد کا ذکر کرتے ہیں اور زمانے و حالات کے فرق پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے وقت کے لوگوں کے لئے ان کو غیر کارآمد ثابت کرتے ہیں۔ انہیں کے الفاظ میں:

”ہم یہ نہیں کہتے کہ سلف صالح کے حالات ہماری قوم کے لئے

بالکل فائدہ مند نہیں ہیں۔ ان کی بائیوگرافی میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو قومی زندگی کے لئے بمنزلہ ارکان و عناصر کے ہیں۔ محنت، صبر، استغفار، غیرت، دلیری، اولوالعزمی اور عالی حوصلگی سب کچھ ان کے کارناموں میں موجود ہے مگر جن مہماں میں انہوں نے ان ہتھیاروں سے کام لیا تھا ہماری مہماں ان سے بالکل الگ جدا گانہ ہیں جو شاید ان کو کبھی پیش نہیں آئیں۔ جن آلات سے انہوں نے ملک فتح کئے تھے ہم کو انہیں آلات سے دل فتح کرنے ہیں۔ جو عزت اور آبرو انہوں نے اپنی قوم کی سلطنت میں حاصل کی تھی وہ ہم کو غیر قوموں کی حکومت میں حاصل کرنی ہے..... جب کہ ہماری حالت سلف کی حالت سے اس قدر بدی ہوئی ہے تو ان کی بائیوگرافی ہماری مشکلات پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔ یہ چج ہے کہ ان کی ہمت سے ہماری ہمت اور ان کی دلیری سے ہماری دلیری بڑھتی مگر یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی ہمت اور دلیری سے کیا کیا کام لیا تھا اور ہم کو اس سے کیا کام لینا چاہیئے..... پس اگر چہ زمانہ سلف کے مشاہیر بلکہ مجاہيل کی بائیوگرافی بھی منفعت سے خالی نہیں لیکن اس میں ہمارے لئے کوئی ایسی صاف اور کھلی شاہراہ موجود نہیں ہے جس پر ہم آنکھیں بند کر کے اپنی دشوار منزل طے کرتے چلے جائیں گے۔

اقریباً ۹ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب یعنی حالی کی تصنیف کردہ حیات جاوید سر سید کی زندگی پر ایک مفصل اور مبسوط سوانح عمری ہے۔ حالی کی سات سال کی مسفل محنت، کاؤش اور تگ و دو کے بعد ۱۹۰۱ء میں سر سید کے انتقال کے بعد یہ کتاب شائع ہو سکی۔ حالی اسے کئی سال سے مرتب کر رہے تھے لیکن انہوں نے سر سید کو کبھی نہیں

دکھائی اور نہ ہی سر سید نے اس کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سر سید کا انتقال ہوا تو حالی کو اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ انہوں نے اس کا مسودہ سر سید کو کیوں نہیں دکھایا تاکہ وہ اپنے منفید مشوروں سے نوازتے۔ سر سید کے انتقال کے بعد حالی پوری تندی اور یکسوئی کے ساتھ اس کام میں جث گئے تاکہ وہ جلد از جلد محسن قوم کی سیرت منظر عام پر لا سکیں اور لوگ اس سے سبق حاصل کر سکیں لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ جلدی میں کام خراب ہو جائے۔ اسی زمانے میں خوجہ سجاد حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ۔“

”لوگ ہر طرف سے اصرار کر رہے ہیں کہ دو تین میونے کے اندر اندر کتاب مکمل کر دو مگر میں ہرگز کسی کی نہیں سنوں گا اور جب تک میرے حسب دخواہ سر سید کی لا ناف مکمل نہ ہوگی اس وقت تک اس کا شائع ہونا نہ چاہوں گا۔ عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لائق دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لا ناف تیار ہوگی اسی قدر کثرت سے فروخت ہوگی مگر اس بات کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ لا ناف عمده لکھی جائے اگر چہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو ۔“

اس اقباس سے سچے فن کا رکان نقطہ نظر جھلکتا ہے۔ اسی وجہ سے حالی نے اپنے فن کے ساتھ بھر پور انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پورے طور پر اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیوں اور کیسے ہوا اس کا تجزیہ ہم اگلے صفحات پر کریں گے۔

مولانا کو سر سید کی لا ناف لکھنے کا خیال سب سے پہلے اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہ کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا اور تمام مخالفتوں کے باوجود اپنی منزل کی طرف روای دواں تھا۔ تہذیب الاحقاق میں سر سید اپنی دلکش تحریروں سے اردو زبان کو سیراب کر رہے تھے۔ اگر چہ سر سید رفاه عام کے

کاموں میں ایک مدت سے مصروف تھے لیکن ہر کوئی اس سے واقف نہیں تھا۔ تاہم ملک میں ان کی خدمات کی قدر ہو چکی تھی۔ ان کی وقعت حالی کے دل میں بھی روز بروز زیادہ ہونے لگی تھی۔ اسی وقت سے حالی نے سر سید کی زندگی سے متعلق چیزوں کو قلم بند کرنا شروع کر دیا تھا۔ حالی نے کچھ سوال مرتب کر کے براۓ جواب سر سید کے پاس روانہ کئے لیکن انہیں کسی سوال کا جواب نہیں ملا۔ بعض لوگوں نے انہیں یہ رائے دی کہ سر سید کی زندگی میں ان کی لائف لمحنی مناسب نہیں۔ آخر کار حالی نے اپنا یہ ارادہ موقوف کر دیا۔ لیکن حالی کے دل میں ہمیشہ اس کا خیال پیدا ہوتا رہا کہ وہ سر سید کی لائف لکھیں۔ حالی کا اپنا ارادہ موقوف کرنے کے کچھ دنوں کے بعد سر سید کے مخلص دوست حاجی اسماعیل خاں کی تحریک سے حالی کے دوست فتحی سراج الدین سر سید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ انہوں نے پوری کوشش سے اس کے لئے لاکھ مواد جمع کیا اور ایک خاص حد تک اس کو مرتب کر کے حاجی صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد کئی برس تک وہ مسودہ پڑا اور جچھپ نہ سکا۔

ایک انگریز کرنل گریٹم نے اس سے قبل ہی انگریزی میں سر سید کی لائف کو مرتب کر دیا تھا۔ حالی اسی کے متعلق فرماتے ہیں:

”تعجب کی بات ہے کہ ایسی قابل فخر بائیوگرافی جس کا لکھنا مسلمانوں کا نہایت ضروری فرض تھا اسکے لکھنے کا خیال سب سے پہلے ایک شریف انگریز کو آیا۔ کرنل گریٹم نے سر سید کی لائف ان کی وفات سے تیرہ برس پہلے انگریزی میں لکھ کر شائع کر دی اور اس ضروری کام میں سبقت کرنے کا فخر مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔“<sup>۱</sup>

یہ سب دیکھتے ہوئے حالی کے دل میں جوش پیدا ہوا کہ سر سید کی لائف انہیں کی زندگی میں پورا کر لیں تو اچھا ہو گا۔ اس خیال سے انہوں نے علی گڑھ میں ۱۸۹۲ء میں چند ماہ قیام کیا اور اس وسیع ذخیرہ معلومات سے فائدہ اٹھایا جو وہاں موجود تھا۔ فتحی

سراج الدین صاحب کا مسودہ بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اس وسیع اور مصروف زندگی کے حالات کو جمع کرنے کے لئے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور سر سید کی جملہ اصناف کو کھنگالا۔ ان کے خطوط، ان کے دوستوں کے بیانات، انگریزی اخباروں، سرکاری رپورٹوں، موافق و مخالف رسالوں اور بعض مدیر ان سلطنت کی تحریروں کو پڑھ کر ان سے بھر پورا استفادہ کیا۔ انہوں نے گریہم کی کتاب LIFE AND WORK OF SIR SYED AHMAD KHAN ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ سیرت فرید یہ سے بھی فائدہ اٹھایا جسے سر سید نے اپنے ناتا کے حالات میں مرتب کیا تھا اور ضمنی طور پر اپنے بچپن کے حالات لکھ دے تھے۔ غرض یہ کہ ایک معاصر ہونے کی وجہ سے حالی کو مواد حاصل کرنے میں زیادہ دشواریاں نہیں جھیلنی پڑیں۔ سب سے زیادہ الجھن اس وقت درپیش آئی جب ترتیب و انتخاب کا مسئلہ آیا جیسا کہ یہ کسی بھی سوانح نگار کے لئے سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن سر سید جیسی متعدد شخصیت کی سوانح نگاری کے لئے حالی کو اور بھی کئی نہیں مراحل سے گزرنا پڑتا۔ دیباچہ حیات جاوید میں وہ رقم طراز ہیں:

”اگرچہ سر سید کی لاکف کا لکھنا بظاہر ایک آسان کام معلوم ہوتا ہے کیونکہ سنہ ستاون سے لے کر اخیر تک جو کچھ انہوں نے کیا وہ سب چھاپے کے ذریعہ مشہر ہو گیا ہے اور سنہ ستاون سے پہلے کے حالات بھی معتبر ذریعوں سے معلوم ہو گئے ہیں مگر درحقیقت ان کی تمام سوانح عمری کا سمیننا نہایت دشوار کام ہے۔ ان کی زندگی ایسے اہم واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ نہ کسی واقعہ کو سرسری سمجھ کر چھوڑا ہی جا سکتا ہے اور نہ ہر ایک واقعہ کو مفصل بیان کیا جا سکتا ہے..... اس سے بھی زیادہ سخت مشکل جو باسیوگرانی کے مضمون سے علاقہ رکھتی ہے یہ ہے کہ سر سید کی ذات میں اس قدر مختلف اجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اس کی شان اور اس کے درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک

ایسا کام ہے جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کر سکتا ہے جو خود بھی سر سید کے برابر جامع حیثیات ہو۔<sup>۱</sup>

ہم مانتے ہیں کہ حالی کی شخصیت بھی سر سید کی صحبت کے اثر سے ایک جامع الحیثیات شخصیت ہو گئی تھی۔ حالی کو اپنے موضوع سے بے حد لگاؤ اور عقیدت ٹھی۔ وہ اپنے ہیرو کے مقصد زندگی کو عام کرنے کے لئے فن سوانح کی تمام مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے لئے تیار تھے۔ اسی لئے وہ کسی بھی طرح اس کام میں پچھے نہیں ہے اور پوری دیانتداری اور صداقت کے ساتھ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہوچایا۔ بلاشبہ سر سید کی طرح حالی کی علمی، ادبی، ملکی، اور قومی کارناموں اور ان کی اصلاح سے دلچسپی، سر سید کی رفاقت، سوانحی مواوائی فراوانی، برسوں سے ان کی سوانح عمری لکھنے کی نیت اور سعی ہر چیز نہیں اس کا استحقاق اور موقع فراہم کرتی تھی کہ اسے ایک لا زوال شاہکار کی شکل دیں۔ اردو کے ایک عظیم ادیب کو ہندوستان کے ایک عظیم ترین انسان کی سوانح عمری لکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ حالی کو م از کم پچیس سال تک سر سید کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے سر سید کو نہایت قریب سے دیکھا اور ان کے کارناموں میں ہاتھ بٹایا۔ حالی ایک ادیب ہونے کی وجہ سے سر سید کو ایک باعمل انسان ہونے کی حیثیت سے بے حد پسند کرتے تھے۔ علاوہ بریں حالی اپنی طبعی شرافت، رواداری اور فراخ دلی کی بنا پر دوسروں کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان کا انسار اور ان کا طالب علمانہ جذبہ ہمیشہ دوسروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کا باعث ہوتا تھا۔

حالی نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سر سید کی زندگی کے واقعات اور ان کے تمام کام ترتیب وار بقید تاریخ بیان کئے گئے ہیں۔ سر سید کی ولادت، بچپن، خاندان، تعلیم، ابتدائی تصنیف، سرکار انگریز کی نوکری، غدر کی حالت اور اس فتنہ و فساد میں ان کی خدمات، ابتدائی تعلیم، جدوجہد و مشاغل، رسالہ اسباب بغاوت ہند کی تکمیل، سائنس فک سوسائٹی کا قیام، اردو زبان کی حمایت، سفر لندن، سی۔

ایس۔ آئی کا خطاب، تہذیب الاخلاق کا جاری ہونا، کاج کا افتتاح، تفسیر قرآن، ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام، انڈین یونیشنل کانگریس کی مخالفت، پارلیمنٹ میں تقاریر اور وفات تک کے واقعات اس حصے میں شامل کئے گئے ہیں اور چھوٹے ابواب میں تقسیم کر کے ان پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں سرید کی ترقی کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دراصل یہ حصہ مصنف کی سعی و محنت کا خلاصہ ہے۔ مصنف نے کمال محنت، لیاقت اور نکتہ بخی سے سرید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس حصے میں سرکاری خدمات، پولیسکل خدمات، ملکی و قومی خدمات، مذہبی خدمات، سرید کی مخالفت، کامیابی اور اس کے اسباب، سرید میں مختلف لیاقتوں کا ہونا، شکل و شامل، اوضاع و عادات، اخلاقی خصائص اور مذہب جیسے موضوعات قائم کر کے ذیلی عنوانات کے تحت تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے کا پہلا باب ۱۸۱ء سے ۱۸۳۸ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے جس میں تاریخ ولادت اور خاندان سے لیکر عنفوں شباب تک کے حالات کا ذکر ملتا ہے۔ دوسرا باب (۱۸۳۸ء۔ ۱۸۵۷ء) ملازمت کے بیان سے شروع ہو کر بجھوڑ میں علاوہ فرانس منصبی کے کمیٹی رفاه عام کے تمام کام سرانجام کرنے پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا باب (۱۸۵۷ء۔ ۱۸۶۸ء) میں سب سے پہلے حالی نے ایام غدر کے مصادب اور سرید کی خدمات کا بیان کیا ہے اور انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کرنے کے بیان پر اسے ختم کیا ہے۔ چوتھا باب (۱۸۶۹ء۔ ۱۸۷۰ء) سفر انگلستان سے شروع ہوتا ہے اور اخبار، ہم روڈیل میں سرید کی نسبت ایک آرٹیکل کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس مضمون کے چند فقرے حالی نے درج کئے ہیں۔ پانچویں باب (۱۸۷۰ء۔ ۱۸۷۸ء) میں پہلے سرید کا ولایت سے ہندوستان واپس پہنچنے کا بیان ہے اور آخر میں تفسیر القرآن کا ذکر ہے۔ اس حصے کے چھوٹیں اور آخری باب (۱۸۷۸ء۔ ۱۸۹۸ء) میں جس لیٹوکنسل (Legislative Council) کی ممبری سے لے کر ۲۵ ہزار کا چندہ میموریل کے لئے لکھے جانے تک کا بیان ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ ۲۹۸ صفحے پر ختم ہوتا

ہے۔ دوسری حصہ ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تھا کتاب کا مختصر اور سرسری خاکہ جس کے بعد کتاب پر تنقید کی نوبت آتی ہے۔ ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ خود حالی کافی سوانح نگاری کے متعلق کیا نقطہ نظر تھا۔ یہ جاننے کے لئے ہم دیباچہ حیات جاوید سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

”اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیرو دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں ہے کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کرنیکل طریقہ سے لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں بخیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمعے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسب رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پرآشوب دریا کے منجدھار میں اپنی ناؤں نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے یا،“

ذرا اور آگے بڑھ کر وہ سر سید کی عظمت بیان کرتے ہیں اور فن سوانح کے سلسلے میں ایک رائے قائم کرتے ہیں:

”وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی اثربچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی

لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سر سید کے مخصوص ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلایاں کہ سر سید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی زگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ حق میں اور صرف حق ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کریڈ کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جو ہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں ۔“

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حالی سر سید کی سوانح لکھتے وقت الجھنوں اور ذہنی مشکلات میں لگرے ہوئے تھے کیوں کہ ایک طرف وہ زمانے کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے کریٹیکل سوانح نگاری سے احتراز کرنا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے حیات سعدی اور یادگار غالب لکھتے وقت محض انگلی خوبیوں ہی پر زور آزمائی کی ہے جب کہ ان کی شخصیات بھی ایسا ہی تقاضا کر رہی تھیں۔ لیکن دوسری طرف حالی سر سید کی شخصیت کے انتہائے کمال کے معرف ہیں لہذا انہوں نے نکتہ چینی کی ضرورت پر زور دیا اور اس کا دعویٰ بھی کیا۔ تیسرے سر سید کے کارناموں کی انگلی زگاہ میں بڑی اہمیت تھی اور انہیں وہ عوام کے سامنے پیش کرنا بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ یہ تمام باتیں حالی کے دماغ میں گونج رہی تھیں اور ایک دوسرے سے ٹکرار، ہی تھیں۔ ایسی حالت میں متنباد باتوں سے پچ کر نکل جانا یا کم از کم ان میں الجھ کرنے رہ جانا بڑی قابلیت کی بات ہے۔ حالی کا معتدل اور متوازن نقطہ نظر یہاں کام آیا اور ان کے خلوص و دردمندی نے وہ کام انجام دیا جس کا پورا کرنے والا اس وقت کوئی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن عملاً دیکھنا یہ ہے کہ تمام الجھنوں کے ہوتے ہوئے حالی سوانح نگاری کے اصولوں سے کس طرح سبکدوش ہو سکے ہیں۔ نئی حیثیت سے سوانح نگار کے فن کو پر کھتے

ہوئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسے ہیرو کے حالات زندگی قلم بند کرتے وقت دیانت، صداقت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا ہے یا نہیں اور ساتھ ہی تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتیٰ المقدار فروغ نہ کیا ہے۔ ذاتی پسند یا ناپسند اور اپنے معتقدات کو تو جگہ نہیں دی ہے۔ حیات جاوید کو بغور پڑھنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حالی نہ تو پوری طرح اپنے دعوے کو پورا کر سکے ہیں اور نہ فتنی اعتبار سے پوری طرح کا میاب ہوئے ہیں لیکن سوانح نگاری میں جو مشکلات پیش آئی ہیں وہ ان پیچیدہ را ہوں سے ضرور کسی نہ کسی حد تک کا میابی سے گزر گئے ہیں۔ انہوں نے دیانت اور صداقت کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا لیکن اپنی خواہشات کے مطابق بعض جگہوں پر سر سید کے کاموں کی تاویلیں ضرور کی ہیں۔ کہیں واقعات کو محض سطح پر دیکھا ہے اور کسی جگہ مصلحت کو ضرورت سے زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے باوجود نہ تو واقعات کو توڑ مرد کر پیش کیا ہے اور نہ ہی سر سید کی عظمت کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے۔ ان میں معاصرانہ رقبابت کا نہ تو کوئی جذبہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہی انہوں نے خیال آرائی سے کام لیا بلکہ تقاضاً بشریت کے مطابق سر سید کی خوبیاں اور خامیاں دونوں پیش نظر رکھی ہیں۔ مگر ان کے کارناموں کو زیادہ اجاگر کر کے پیش کیا ہے اور خامیوں کی طرف محض اشارے کئے ہیں۔ لوگوں کو یہ اعتراف تھا کہ حالی نے سر سید کی حمایت میں لمبی لمبی تمہیدیں لکھی ہیں اور ان کے کارناموں کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں سر سید سے ان کی رفاقت کو ضرور دخل ہے جس کے سبب وہ سر سید کے کاموں کے اور زیادہ قدر دان ہو گئے تھے۔ اس قدر دانی نے موت کے بعد قومی دل سوزی اور یاد عزیز کی بھی صورت اختیار کر لی۔ بلاشبہ یہ اعتراف ایک حد تک درست ہے۔ مولانا حالی کی تحریروں میں سر سید کی حمایت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ مخصوص حالات کی وجہ سے اس کی ایک حد تک ضرورت بھی تھی لیکن اس کی وجہ سے فن سوانح نگاری کو مجرور نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مجموعی حیثیت سے سر سید کو جس وقار و عظمت کے مرتبے پر بٹھایا گیا ہے وہ ضرور اس کے مستحق تھے۔

سوانح نگاری کی مهم محض علمی لیاقت و صلاحیت کے سہارے طے نہیں کی

جا سکتی۔ یہ وہ فن ہے جس کی تکمیل کے لئے جذبہ ہمدردی اور انس و محبت کی ضرورت ہے جو ہیر و کمزوریوں کے اعتراض کے باوجود اسکی عظمت اور شرف و فضیلت کو بھی دیکھ سکے۔ جانسن کے قدر دانوں اور دوستوں میں علم و فضل سے مالا مال لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ مگر ان میں باسول کے سوا ایسا کوئی نہ تھا! جو جانسن سے پچی محبت کی اس انتبا تک پہنچا ہوا ہو جہاں تک اس کا یہ حقیقی سوانح نگار پہنچ سکا۔ جانسن کے مزاج کی تختی، تندی و تیزی اور اس کی انتہا پسندی غرض اس کی ساری کمزوریاں اس پر روشن تھیں مگر ان سے اس کے انس و عقیدت میں کبھی کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی۔ وہ برابر جانسن کی زندگی میں دلچسپی لیتا رہا اور اس کی حرکت و عمل کا جائزہ لیتا رہا۔ اپنی اس دلچسپی اور مستقل مزاجی کے طفیل وہ اپنے ہیر و جانسن کے اصل اور حقیقی روپ کو پیش کر سکا۔ حالی نے بھی جو ہر محبت کی تلاش میں بے حد مشقتیں برداشت کی ہیں۔ سوانح نگاری کی وادی میں قدم رکھنے والے کو جس جو بڑی تلاش ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت مادی عظمت کے نقطہ نظر سے معین نہیں ہوتی بلکہ اس کا معیار بڑی حد تک جذباتی اور معنوی ہوتا ہے۔ ایک سوانح نگار پچی انسانیت کا علمبردار ہوتا ہے اور ایک حد تک خود بھی اسی انسانیت سے متصف ہوتا ہے۔ اسی حوصلہ مندی سے اس میں قلب و نظر کی وسعت ہوتی ہے۔ اسی حوصلہ مندی سے وہ انسانی فضائل کی قدر دانی کے قابل ہو کر اس کی کمزوریوں کو سمجھنے اور معاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور سب سے آخر میں یہ کہ وہ ایک مشفق ہمدرد، ایک شفیق دوست اور ایک حوصلہ مند رُّفق اور قدردان ہوتا ہے کیونکہ وہ اگر ایسا نہیں تو اسے سوانح عمری لکھنے کا اہل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ سوانح نگاری کے ان تمام تقاضوں کا بیان ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں لیکن یہاں بیان کا مقصد یہ ہے کہ انکی روشنی میں حالی کی سوانح نگاری کو دیکھا اور پرکھا جائے۔ بلاشبہ وہ ایک حقیقی سوانح نگار کی تمام صفات سے متصف تھے اور قدرت کی طرف سے ایک ایسا دل و دماغ لے کر آئے تھے جس میں شریفانہ جذبات، جو ہر شناسی، سلامت مزاجی اور انس و محبت کے احساسات بدرجہ اتم موجود تھے۔ انہیں اوصاف کے بناء پر انہیں خوش صفات حالی کا خطاب بھی ملا۔ یہ بالواسطہ اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ فطرتاً ان تمام صلاحیتوں کے

مالک تھے جو سوانح نگاری کی بنیادی شرائط میں داخل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حالی نے کسی معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا اسی لئے کتاب ضخیم بھی ہو گئی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ سیرت کی کتاب ہمیشہ تصنیف سے زیادہ تالیف کا درجہ رکھتی ہے اس لئے یہ اعتراض کہ حیات جاوید تصنیف نہیں تالیف ہے، بالکل یہاں ہے۔ بلکہ حالی کی خاکساری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی تصنیف کردہ کتاب کو بھی مرتبہ لکھتے تھے۔ اعتراضات کی دنیا میں کبھی بھی کمی نہیں ہوتی۔ بعض حضرات محض مخالفت میں اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحب کا واقعہ مولوی عبدالحق کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

”جب حیات جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لئے، ایک مولوی عبدالعزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لئے جو اتفاق سے حیدر آباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا کہ ”یہ کذب وافتراء کا آئینہ ہے“، وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا سوء ادب تھا لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بیکار تھا۔“

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ہماری قوم کی اکثریت کے مزاج کو اغراض پسند طبقوں نے شخصیتوں کے معاملے میں نہایت حساس بنا دیا ہے۔ ہم دل میں کسی کے لئے عقیدت پیدا کر لیں تو اسے پوچھنے کی حد کو جا پہوچنے ہیں اور اس کے بر عکس نفرت کرنے پر اتریں تو نہ صرف یہ کہ موت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے بلکہ اسکی لاش پر بھی مسلسل لٹھ مار مار کر اپنے جذبات کو تسلیم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اہم اشخاص بھی عام لوگوں کی طرح گوشت پوست

کے انسان ہوتے ہیں اور ہر انسان خوبیوں اور کمزوریوں کا حامل ہوتا ہے۔ اختلاف رائے کی گنجائش سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن اختلاف برائے اختلاف ہرگز پسندیدہ نہیں۔ بہت سی نامور ہستیاں بعض معاملات میں ایک دوسرے کی تخت مخالف ہونے کے باوجود عام لوگوں کے لئے قابل احترام ہوتی ہیں۔ مگر یہ عجیب معیار ہے کہ جس شخص کو ہم پسند نہیں کرتے تو وہ جو بھی کہے اس پر غور کئے بغیر اس کے قول کو مردہ تھہرا�ا جائے لیکن وہی بات انہی حالات کے تحت انہی الفاظ میں ہمارا پسندیدہ شخص کہے تو اس کا قول مستحسن قرار پائے بلکہ اس کو ثابت کرنے لئے ہم حقائق کو توڑ مروڑ کر رکھ دیں۔ یوں اپنی نگاہوں میں تو ہم ان شخصیات کے ساتھ عقیدت یا انفرت کے اظہار کی انتہا کر کے سرخ رو ہو جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے انصاف نہیں کر پاتے۔

سرسید احمد خاں برصغیر میں انیسوی صدی کی ان شخصیات میں سے ہیں جن کی ترجمانی کرتے ہوئے ہم نے حق و صداقت سے کام نہیں لیا۔ اگر ہمیں اپنے نظریہ کے مطابق ان کے بعض اقوال و افعال سے اصولی طور پر اختلاف ہے تو خن طرازی کے جو ہر دکھا کر ان کی ہر اچھی بات کو بھی رد کر ڈالتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بڑا کام انجام دیا۔ اس کے بر عکس اگر ان کے عقیدت مند ہوئے تو حسین الفاظ کی بندش کے ساتھ ان کے ہر کام کی عظمت بیان کر کے یہ خیال کرتے ہیں کہ حق ادا کر دیا مگر اس ادائے حق میں ہم بعض حقائق کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر کرتے ہیں تو سرسید کی قومی خدمات کا زمانہ ہمیشہ اس کے بعد سے شروع کرتے ہیں اور خاص اس جنگ کے دوران انہوں نے مسلمانوں کے ضمن میں جو خصوصی رو عمل اپنایا اس کا ذکر ارادتا گول کر جاتے ہیں۔ حالانکہ سرسید نے اپنی تالیف ”سرکشی ضلع بجنور“ میں اس کا بالتفصیل ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سرسید اپنی جن خدمات پر عمر بھر فخر کرتے رہے ہم ان کا تذکرہ غالباً اپنی ہتھ سمجھتے ہیں۔ اور جس نظریہ کے خلاف وہ آخر دم تک وعظ کرتے رہے انہیں اسی کا خالق قرار ہے یعنی لگتے ہیں۔

سرسید ایک ادیب، انشاء پرداز، صحافی، سیاست داں، مورخ، فلسفی، عالم دین، مفسر، مفکر، مبصر، مقرر، اور قانون دان ہی نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کا شمار تعلیمی ماہرین میں بھی کیا جاتا ہے۔ علیگڑھ کالج اور سرسید کا نام ہمیشہ لازم و ملزم و مرہب ہیں گے۔ ان سے منسوب علیگڑھ تحریک ان کی شہرت کو بلند و بالا کرنے کا سبب بنی۔ بر صغیر کے مسلمانوں کو ایک خاص نجح پر چلا کر انہوں نے بڑا نام پیدا کیا اور ریفارمر بھی کہا گئے۔ وہ ایک باعمل انسان تھے۔ جو کہتے تھے اسے کر کے بھی دکھاتے تھے اور اس سلسلے میں کسی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اپنے عزم کی تکمیل کے لئے انہوں نے تنازعہ فیہ شخصیت بننا گوارا کر لیا مگر جو چاہا سو کیا۔ مخالفین کی گھن گرج کے درمیان بھی وہ بڑے اعتقاد کے ساتھ اپنے مشن میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ان کے بعض کام کسی کی نظر میں کتنے ہی غلط ہوں، ان کی ہمت اور ثابت قدمی کے اصل اسباب ان کے پیچھے وقت کی سیاہ سفید کی مالک "قوت عظمی" کا مکمل تعاون ہی کیوں نہ بتایا جائے، مخالفتوں کے شدید طوفان میں قابل رشک جوش و خروش کے ساتھ اپنے کام میں ملن رہنا ان کے عزم و حوصلہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ وہ جس کام کو اپنے طور پر درست سمجھتے تمام رکاوٹوں کو پچلانگتے ہوئے گزرتے۔ خود اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ جزئیات کی حد تک بھی اپنی رائے پر ثوق رکھتے، اپنی رائے کی مخالفت میں کسی تجویز کو خاطر میں نہ لاتے اور چنان کی طرح ڈٹ کر ہمیشہ اپنے ہی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں کامیاب ہوتے۔ مختصر آیہ کہ سرسید انیسوی صدی کی ایک ایسی ہنگامہ خیز اور پر عمل مسلسل تحریک کا نام ہے جو مسلمانوں کی قومی بھلائی اور ترقی کے نام ایک مدت تک جاری رہی اور جس نے بر صغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر نہایت ثبت اور منفی اثرات مرتب کئے۔ حیات جاوید کے ہیروکی یہ عظمت سوانح نگاری کے فن کے عین مطابق ہے۔

جہاں سرسید کے ذائقی اور خاندانی حالات کا تعلق ہے سر درست ہمیں ان سے بحث نہیں ہے۔ مولانا حالی نے ان حالات کو تفصیل سے لکھ دیا ہے سوائے ان چند چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات کے جو سرسید کی وفات کے بعد ان کے دوستوں اور مداحوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں اور کوئی قابل ذکر بات ایسی نہیں جو حالی کی

حیات جاوید میں موجود ہے۔ حالی کی اس کاوش کے لئے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے قاضی احمد میاں اختر جونا گزہمی رقم طراز ہیں:

”سر سید ایک جامع حیثیات شخص تھے اور ان کے حالات زندگی لکھنے میں عموماً ان کی تمام حیثیتوں میں یکسانیت اور ان کے ذاتی خیالات اور ان کی قولی اور نہ بھی خدمات کے درمیان ایک خاص رابط ہے جس کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ ایک سوانح نگار کے لئے بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ اس میں صریحی جنبہ داری اس کی محنت کو بر باد کرنے اور سخت تنقید اپنے ہیرو کی تمام خوبیوں کو ملیا میٹ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے مولانا حالی جس دشوار گزار ذمہ داری سے عبده برا آ ہوئے ہیں وہ یقیناً لا اُق تحسین اور قابل صد آفریں ہے۔“<sup>۱</sup>

جیسا کہ ذکر کیا گیا حالی نے تین سوانح عمریاں لکھیں، حیات سعدی، یادگارِ غالب، اور حیات جاوید۔ یہ انتخاب خود حالی کے احساسات و رحمات کا آئینہ دار ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد حیات سعدی کو اول اور یادگارِ غالب کو آخری درجہ پر رکھتے ہیں۔ غالب ان کا خیال تھا کہ غالب کی جیسی مکمل اور دلاؤیز تصویر کی حالی سے توقع کی جاتی تھی وہ ان صفحات میں نہیں ملتی۔ بعض مصنفوں نے سوانح نگاری کے فنی مطالبات پر بحث کی ہے اور تصویر کے دوسرے رخ کی کمی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنے مضمون سے اسے گہرائگا و اور ہمدردی ہو۔ کوئی بے تعلق یا مخالف شخص سوانح نگاری کے منصب کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ جو مصنف اپنے تجربات و احساسات کو بیان کرنے میں دیانت اور سچائی سے کام لیتا ہے وہ سوانح نگاری کا حق ادا کر سکتا ہے۔ حالی کے یہاں دیانتداری بھی تھی اور قلبی رگا و بھی۔ انہوں نے بعض کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں کوتا ہی نہیں برتنی بلکہ شرافت، متانت اور احترام کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حالی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ہیرو

<sup>۱</sup> قاضی احمد میاں اختر۔ سر سید کاظمی کارنامہ، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳

سے متعلق جملہ لٹریچر کا مطالعہ کرتے تھے اور اس میں کبھی تابل سے کام نہیں لیتے تھے۔ حیات جاوید کھنچتے وقت ایک ہم عصر کی سوانح عمری لکھنے میں جتنی دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ سب حالی کو پیش آئیں۔ ایک طرف معاندانہ تبصرے تھے تو دوسری طرف معاصرانہ چشمک۔ حالی نے ان سب سے منھ موز کر دیانت داری سے اپنا کام انجام دیا۔

کلی طور پر اگر دیکھا جائے تو حیات جاوید کی جو تصویر حالی نے بنائی ہے اس میں سر سید ایک عام انسان کی مانند پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکے ہیں۔ مولانا حالی نے زیادہ تر سر سید کی لکھی ہوئی ”سیرت فرمیدیہ“ سے ان کے بچپن کی تصویر میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ باتیں خود سر سید سے معلوم اور کچھ دوستوں سے معلوم کر کے اور کسی حد تک اپنی ذاتی معلومات کو سامنے رکھ کر اس حصے کو مکمل کیا۔ سر سید سے ان کی قربت اور فن سوانح نگاری کا تقاضا تھا کہ سر سید کی شخصیت سے متعلق معلومات زیادہ ہوں۔ بہت ضروری ہے کہ ہیرو کی عظمت و بزرگی کے اسباب بیان کرنے سے قبل اس کے ذہنی ارتقاء کو تفصیل سے واضح کیا جائے۔ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات پوری زندگی کی نقاب کشانی کر دیتے ہیں۔ حالی نے کہیں کہیں واقعات کی تفصیلات میں اختصار سے کام لیکر فتنی کمزوری کا ثبوت دیا ہے جب کہ بعض جگہوں پر بظاہر معمولی لیکن حقیقتاً ہم واقعات کو درج کر کے سر سید کی زندگی کو سمجھنے کے لئے موقع فراہم کیا۔ اس سے حالی کی فطرت انسانی سے گہری آشنائی کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ سر سید کی تعلیم کے ذیل میں بہت اختصار سے کام لیتے ہیں اور بہت ضروری باتوں کا ہی ذکر کرتے ہیں حالانکہ ہم کبھی جانتے ہیں کہ کسی شخصیت کے ذہنی ارتقاء میں تعلیم کا بڑا روپ ہوتا ہے۔ حالی کو چاہیئے تھا کہ وہ سر سید کی تعلیمی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مختلف واقعات کو پیش کرتے۔ دوسری طرف وہ سر سید کے عنفوان شباب کے ذکر میں چند چھوٹی اور دلچسپ باتوں کو بھی درج کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

”سر سید جیسے بڑھاپے میں بذله سخ تھے جوانی میں اس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی ان کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوالہ شیریں جاں نامی نہایت حسین تھی مگر نہا ہے“

کہ اس کی ماں بھدی اور سانو لے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی سر سید بھی موجود تھے اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے ”مادرش بسیار تلخ است“ سر سید نے یہ مصروف پڑھا ”گرچہ تلخ است ولیکن بر شیرین داروے“ یوں شخصیت کی مختلف کیفیات کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور یہی فن تقاضا بھی ہے۔ حالی نے سر سید کے بچپن کے حالات میں روایتی طور پر عظمت دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے کیونکہ حالی کے نزدیک سر سید میں سوائے جسمانی قابلیت کے شروع میں اور کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ شیخ عبدالقادر اس بات کو نہیں مانتے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ان کی اس رائے کی تائید کرتے ہوئے یہ مثال پیش کرتے ہیں:

”مثلاً اکبر شاہ ثانی کے دربار میں دیر سے جانا اور اصرار کے باوجود معذرت کے الفاظ ادا نہ کرنا بلکہ یہی کہتے رہنا کہ میں سو گیا تھا، سر سید کی ذہنی اور افتاد طبیعت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے ان میں ایک مسلک پر جمع رہنے کا مادہ پیدا کیا۔“

دراصل سر سید کی تربیت اور ان کے اخلاق و عادات بلکہ ان کے تمام واقعات زندگی میں ان کی والدہ کا بہت بڑا ادخل ہے۔ اسی لئے حالی نے ان کے اس کردار کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سر سید نے ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا جسے حالی درج کرتے ہیں:

”جب میں صدر امین تھا تو اس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اس کو ایک سخت مو اخذہ سے بچایا تھا مگر ایک مدت کے بعد اس نے در پردہ میرے ساتھ برائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی۔ گناہ عرضیاں صدر میں بھیجا رہا۔ آخر تماں وجہ

۱۔ حالی۔ حیات جاوید، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۵۷-۵۸

۲۔ ڈاکٹر عبدالقیوم۔ حالی کی اردو نشر نگاری، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۲۱۸

ثبت جس سے اس کو کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ آگئی اور اتفاق سے اس وقت مجرمیت بھی وہ شخص تھا جو اس کے پھانے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ”سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگذر کرو اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے“ ان کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اس دن سے آج تک مجھ کو بھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور امید ہے کہ کبھی نہ آئے گا بلکہ انہیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اس سے میرا بدلا لے یا۔“

اظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جو سر سید کی والدہ کی نصیحت کے شکل میں ظاہر ہوا ہے لیکن سر سید کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں اس کا زبردست روپ ہے۔ سر سید نے درگزر کرنے کی صفت کو اپنے اندر اس طرح جاگزیں کر لیا تھا کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اس کا اطلاق ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں جبکہ سر سید کی بے حد مخالفت ہو رہی تھی، وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے رہے اور کسی سے انتقام تو کیا سب کی خیر خواہی میں لگے رہے۔ معلوم ہوا کہ حالی نے ان گوشوں کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو سر سید کی ترقی اور نشوونما میں بے حد مدد و معاون ثابت ہوئے تھے۔ حالی کی سوانح نگاری کے معتبر ضمین میں شبلی سب سے بڑے معارض کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ اعتراضات حالی کے ہیرو سر سید سے تعلق رکھتے ہیں۔ شبلی اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں:

”حیات جاوید میں مولانا حالی نے سید صاحب کی یک رخی تصویر

دکھائی بے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے مصائب دکھانا تنگ خیالی اور بد طینی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یوروپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے سوائے اس کے کوہ محض دعویٰ کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہر حال ”حیات جاوید“ کو مدلل مذاقی سمجھتا ہوں یا،

شیلی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں:  
 ”اختلاف آراء بھی کیا چیز ہے۔ حیات جاوید کو میں لاۓ ف نہیں  
 سمجھتا بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔ خیر  
 الناس فيما بعشقوں مذاہب۔“

شبلی کے ان اعتراضات کا ذکر کر کے مہدی بڑی دیانتداری سے حقائق کی روشنی میں ان کا جواب دیتے ہیں۔ ان کی بعض باتیں قابل ذکر ہیں جو ایک اقتباس کی شکل میں یہاں درج کی جا رہی ہیں:

”اسی طرح حالی کی یہ صنعت گری جہاں یورپ کے طرز تحریر سے مانخوا ذہنی بے شلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر فریب طریقہ سے جو ایشائی شاعروں سے ملتا جلتا ہے ”موجودہ یورپ“ کا مدقق اور علمی ترقیاں سب بر باد ہو جائیں گی، لڑپچر کی طرف سے اس نے الوقت دقیقت رسمی اور جوش التفات کا شکریہ لیکن ایک نکتہ داں یہ سوال پیدا کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جس میں محاسن کے ساتھ معاہب ابھار کر دکھائے گئے ہوں۔ کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرت (الائف) کی حیثیت

۱- مهدی افادگی- افادات مهدی، ۱۹۲۳ء، ص ۳۲۱

" " " " ايضاً

سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں وہ ڈاکٹروں کے دائرہ نظر میں ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ حیات جاوید کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں کہ از قوام جرام پیشہ یا ”باب اشرار“ کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیر کا غیر ضروری خاکہ اڑایا گیا ہو۔<sup>۱</sup>

دوسری بات یہ کہ شبی جوفن سوانح نگاری کے لحاظ سے حیات جاوید پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں، یہ بات قابل غور ہے کہ خود جوانب نے اپنی اصناف المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریوں کو کس حد تک ابھا کر دکھایا ہے۔ بالحقیقت ان سوانحوں میں شخصیت کے دوسرے رخ کی کمی ہٹکتی ہے اور وہی اعتراض جوانب نے حالی پر کیا ہے خود ان کے اوپر صادق آتا ہے۔ مہدی افادی نے حیات جاوید پر بصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

”حیات جاوید کے لئے حالی کی طرف سے اعتزار (اپاوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی اور آشناۓ فن ہو کر لکھی ہے اور یہی اونچے سے اونچا معيار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حدیثت سے یوروپ کی طرف مفسوب کیا جاسکتا ہے۔ یہ <sup>لطفی</sup> ہے کہ حیات جاوید کا رئیس التذکرہ فرشته نہیں تھا، انسان تھا لیکن اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطرابی لغزشوں پر جنمیں انسانی کمزوری سمجھتے غالب تھے۔ یہی ما بہ الامتیاز ہے جس کے بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبی کو اس قدر اصرار ہے اور جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا

در اصل سر سید کی زندگی کے دو عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے لیکن اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنفس پہلو کا اس طرح تمایاں کرنا کہ اصل محاسن دب جائیں بالکل ایسا ہی ہو گا جس طرح "ندوہ" کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہیں ہو گا اور جسے شبلی کی علمی نفیت (سائیکلو جی) سے در اصل کوئی تعلق نہیں ہے۔<sup>۱</sup>

صالح عبدالحسین نے بڑے مختصرے دل اور صاف گوئی سے شبلی کے اعتراض کا جواب دیا ہے جو ہماری ناچیز رائے کے مطابق صداقت پر منحصر ہے۔ ملاحظہ ہوا: "لیکن ان کا مشاہض سر سید کے "فضائل و مناقب" بیان کرنا اور مدلل مذاہی نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ بلکہ حالی نے پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ سر سید کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں اور ان کے کاموں کو تنقیدی نظر سے پر کھا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انسان کو اپنے عزیز یادوست کی کمزوریاں ذرا مددھم اور خوبیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس لئے اگر حیات جاوید میں سر سید کی تعریف کا پہلو ضرورت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے تو مقام تعجب نہیں۔ جہاں تک عمائد مدلل مذاہی کا سوال ہے، حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیا نتداری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس لئے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے سر سید کے لئے جو کچھ لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی ہے۔<sup>۲</sup>

۱۔ مہدی افادی۔ افادات مہدی، ۱۹۲۳ء، ص ۲۳-۳۲

۲۔ صالح عبدالحسین۔ یادگار حالی، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۲۲۲

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ حالی و شبلی کی جس معاصرانہ چشمک کی بات ہم نے کی ہے وہ محض ادبی حیثیت سے تھی۔ بھی زندگی میں دونوں علماء کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی شبلی کے بزرگ تھے اور شبلی نے ہمیشہ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ سید شاہ علی کی یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان کی چشمک دراصل سر سید سے تھی۔ حیات جاوید پرنکتہ چینی فی الحقیقت ان کی سر سید سے رشک و رقبابت اور ہم چشمی بلکہ دعویٰ برتری کا نتیجہ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شبلی نے حالی کی حیات سعدی کو ایک ولچسپ، محققانہ اور بے مثل سوانح عمری قرار دیا ہے۔ یادگار غالب کو اردو کی ایک بہترین سوانح عمری بتایا ہے حالانکہ حالی نے اپنی پہلی سوانح عمریوں کے یک طرفہ ہونے کا اعتراف خود حیات جاوید کے دیباچے میں کیا ہے۔ ابتدا میں دیئے گئے اقتباس میں اس کا ذکر ہے۔ لیکن شبلی نے حیات جاوید پر کم از کم نصف درج نہ سخت سخت الفاظ میں اعتراض کیے ہیں۔ حالانکہ محمد حسین آزاد کی "سخنہ ان فارس" پر شبلی کی تنقید میں یہ بھی نہیں اور نہ شبلی کی کسی اور معاصری تصنیف میں تنقید کا یہ لب و لبجہ ہے۔ شبلی کی سر سید سے یہ چشمک محض یک طرفہ معلوم ہوتی ہے۔ سر سید نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی جس کا اعتراف خود شبلی نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سر سید کا نام تک نہیں آیا۔ حیات جاوید کے سلسلے میں گوہہ ایک حد تک صحیح ہی کیوں نہ ہوں اعتراضات کا بار بار کالب و لبجہ آخر کار ان کی بد نتی پر دال ہے۔ اگر وہ حق گو تھے تو انہوں نے سر سید کی سوانح عمری لکھنے سے پہلو تک کیوں کی۔ حیات جاوید سے اچھی تو دوسری کی بات ہے اگر وہ اس جیسی بھی سر سید کی سوانح لکھ دیتے تو اردو دنیا ان کے اعتراضات کی معترض ہو جاتی اور ان کی قابلیت و صلاحیت کی داد دیتی۔

علامہ شبلی کے فاضل دوست حبیب الرحمن خاں شیر وانی نے اس ادبی مبادثہ میں اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے اور حیات جاوید کے دونوں حصوں پر یکے بعد دیگرے تقریباً انواع اعتراضات وارد کئے ہیں۔ حیات جاوید پر ان کا تبصرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حیات جاوید پڑھنے سے قبل ہی خامیوں کی جستجو شروع کر دی ہو گی اسی وجہ سے انہیں کتاب میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ہر حالت میں انہوں نے پہلے ہی

صاحب سوانح اور موضوع سوانح کو لتاڑنے کا مودہ بنالیا تھا۔ ورنہ وہ اس کتاب کی حقیقی خوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے سر سید کی تصنیف کردہ تفسیر القرآن پر اپنا اعتراض وارد کیا۔ حالی نے بڑے صدق دل سے کہا تھا کہ مفسر کے بیان میں ممکن نہیں کہ لغزشیں نہ ہوئی ہوں۔ اس پر شیرروانی صاحب فرماتے ہیں ”یہ کسی جگہ مثلاً بھی نہیں بتایا گیا کہ فلاں فلاں مقام پر لغزشیں ہوئی ہیں یا“<sup>۱</sup>

یہ صحیح ہے کہ حالی نے یہ غلطی کی لیکن اگر وہ لغزشوں کی نشاندہی کرتے تو دلائل سے ان کو ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی جس سے مزید طوالت کا خدشہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ کام کسی سوانح نگار کا نہیں بلکہ مفسر القرآن کا ہے کہ تفسیر کی خوبیوں اور خامیوں کو دلائل کے ساتھ واضح کرے۔ سوانح نگار کا کام محض حقائق کا بیان ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ حالی جیسے سر سید کے عقیدت مند نے ان کی لغزشوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ مولانا شیرروانی نے بعض لغزشوں کی نشاندہی تو کی ہے لیکن دلائل کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ مولانا شیرروانی نے اپنے تبصرے میں یہ سوال انٹھایا ہے کہ سر سید کو تفسیر لکھنے کا بھی حق تھا یا نہیں اور مولف حیات جاوید کی مدد سے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً حالی کے حوالے سے لکھا ہے:-

”سر سید کی تعلیم بہت محدود تھی پھر فن تفسیر کی ایک سطر بھی ان کی درسی کتابوں میں شامل نہیں ہے اور اس بات کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی زمانہ فن تفسیر کے مطالعہ میں صرف کیا ہو یا تفسیر کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو۔ پھر ان کے پاس ہمیشہ ایک اسٹرنٹ روایت کشی کے واسطے رہا ہے“<sup>۲</sup>

یہ صحیح ہے کہ سر سید نے باقاعدہ تفسیر نہیں پڑھی اور تفسیر لکھی لیکن دنیا میں اور بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً گلیڈ اسٹون نے بابل پر ایک کتاب لکھی حالانکہ وہ

<sup>۱</sup> محمد جبیب الرحمن خاں شیرروانی۔ مقالات شیرروانی، مرتب و طابع محمد مقتدی خاں شیرروانی ۱۹۳۲ء، ص ۶۸

<sup>۲</sup> محمد جبیب الرحمن خاں شیرروانی۔ مقالات شیرروانی، مرتب و طابع محمد مقتدی خاں شیرروانی ۱۹۳۲ء، ص ۵۶-۵۷

ایک لفظ عبرانی (Hebrew) کا نہیں جانتا تھا۔ سر سید ایک عالم دین تھے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ عربی زبان کے تمام رموز و نکات سے واقف تھے۔ کرچہ انہوں نے عربی لزیج پر کی تعلیم مکمل نہیں کی لیکن ان کے ذاتی مطالعے اور غیر معمولی صلاحیت نے ساری مشکلتوں کو آسان کر دیا تھا۔

مولانا شیر وانی کا یہ کہنا کہ مولا نا حالی کا سارا زور سر سید کی حمایت میں صرف ہوا ہے، کسی طرح درست نہیں۔ انہوں نے مولا نا وحید الدین سلیم ایڈ یہ معارف علی گڑھ پر بھی جانب داری کا الزام لگایا تھا۔ جہاں تک حالی کی فطرت کا تعلق ہے ان سے کسی معاندانہ روئے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ مزید سوانح نگار کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے ہیرو کی عظمت بڑھانے کے لئے دوسروں کی تحریر کرے یا انہیں پست دکھائے۔ کم از کم حالی کا یہ شعار نہ تھا البتہ بعض جملے بے تقاضاً محبت اور مصلحت ان کے قلم سے حمایت میں ضرور نکل گئے ہیں اور درمیان میں واقعات کی چند کڑیاں ٹوٹ گئی ہیں جس سے غلط فہمی کا امکان پیرا ہو گیا ہے۔ دارا صل حالی نے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے نتائج سے بحث کی ہے جس سے تھوڑی تشنگی معلوم ہوتی ہے لیکن بد دیانتی کا الزام نہیں عائد کیا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ حالی نے جو رائے دی ہے وہ واضح اور صائب نہیں ہے۔

مولانا شیر وانی نے کتاب کے پہلے حصے پر متعدد اعتراضات کیے ہیں۔ ان کے یہ اعتراضات انہیں کے الفاظ میں پیش ہیں:

”حیات جاوید میں بعض فروگز اشتیں قابل لحاظ رہ گئی ہیں مثلاً حلیہ میں ناک کے بھاری پن کا ذکر نہیں حالانکہ ایک مدبر کے حلیہ کا یہ ایک ضروری جز ہے۔ سر سید کی شادی کا ذکر نہیں۔ احباب کے بیان میں یہ ذکر نہیں کہ سر سید نے احباب کس طرح پیدا کئے۔ نواب محسن الملک کا ابتداء بقصہ جنگ آنا اور پھر سر سید کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اسی طرح اور دوستوں کے بھی ابتدائی حالات ہوں گے۔ اس ذکر کے لکھنے

کی ہی وجہ سے بھی ضرورت تھی کہ اس عہد میں لیڈر بننے کا سودا ہر دماغ میں ہے مگر ان صفات سے لوگ عنواناً بے خبر اور بے بہرہ ہیں جو ایک آدمی کو لیڈر بنادیتی ہیں۔“

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے فتنی اعتبار سے یہ حصہ تنشہ ہے۔ درحقیقت اس میں حالی کے اس مزاج کو زیادہ دخل ہے جو ہر چیز کو مقصدیت کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ حالی کا رناموں پر زیادہ زور دیتے تھے۔

مشیر احمد علوی ناظر کا کوروں اپنی کتاب ”علی گڑھ تحریک اور ادب اردو“ میں انہوں نے کل نواعترافات کا اندرانج کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ ”حالی نے کرنل گرینبم اور مولوی سراج الدین ایڈیٹر ”چودھویں صدی“ کے مسودوں کو دیکھ کر حیات جاوید کا حصی اس لیے کوئی ندرت نہیں ہے، مالاہ موجود تھا صرف انہوں نے ایک جگہ اپنے مخصوص طرز انشاء میں پیش کر دیا ہے۔“
- ۲۔ ”اس قدر ضخیم ہے کہ اس میں رطب و یابس کبھی کچھ جمع ہو گیا ہے اور حقائق نظر انداز ہو گئے ہیں۔“

۳۔ ”اکثر واقعات مختلف شکاؤں میں اس کتاب میں مختلف حالات میں موجود ہیں۔ اس سے ادبی حسن زائل ہو گیا ہے۔“

۴۔ ”اکثر واقعات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ اس لیے دماغ پر اس کا مطالعہ بار ہوتا ہے۔“

۵۔ ”اکثر واقعات قصداً نظر انداز کر دیئے گئے ہیں مثلاً سید احمد کی دماغی نشوونما پر کافی بحث نہیں کی گئی ہے۔“

۶۔ ”سید احمد کی تصویر یزیدہ تفصیل و تحقیق کی محتاج تھی۔ موجودہ تصویر نا مکمل ہے۔“

۷۔ ”حیات جاوید تذکرہ سے زیادہ منقبت کی کتاب نظر آتی ہے۔“

۸۔ ””حیات جاوید“ سید احمد کی بے راہ زندگی کا اعتذار کہی جا سکتی ہے۔“

۹۔ ”سید احمد کے مذہبی نظریات، سید محمود کے معاملہ میں کمزوری کا اظہار، ان کے مخالفین کی برا بیاں، کانگریس سے علیحدگی وغیرہ صد بائیس واقعات تھے جو قصداً حالی نے مصلحتاً نظر انداز کر کے ”حیات جاوید“ کی ادبی حیثیت کو زائل کر دیا۔“ مذکورہ مصنفین مندرجہ بالا اعتراضات کے جوابات دینے سے احتراز کرتے ہوئے محض یہ کہنے پر اتفاق آکرتے ہیں کہ:

”الزمات کی ایک طویل فہرست تھی جو حالی پر دور حاضر کے ناقدین نے عائد کئے ہیں۔ جوابات اس کے بہت آسانی سے دیئے جاسکتے ہیں لیکن سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ناقدین کرام خود حیات جاوید سی ایک معیاری تصنیف تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کر دیں تو حقیقتاً یہ بڑی ادبی خدمت ہو گی۔ ایک چدائی سے سینکڑوں چدائی جلتے ہیں۔ حالی کے ادبی وقار کو اس جدید قالب سے کوئی نقصان نہ ہو گا۔ اعتراضات کرنا بڑا آسان ہے۔ جس ماحول اور جس مخصوص فضائیں یہ کتاب تیار کی گئی اس کو لوگ جوش تنقید میں اکثر فراموش کر دیتے ہیں۔“<sup>۱</sup>

ایک ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتاب میں سر سید کی جو تصویر پیش کی گئی ہے کیا وہ ان کی مکمل تصویر ہے۔ جہاں تک شخصیت کے خارجی واقعات کا تعلق ہے حالی نے ان کو جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کی نفیاں بیان کرنے سے اکثر قاصر رہے ہیں۔ اس میں سر سید کے مشن، ان کے کارناموں، ان کی خدمات اور ان کے مشاغل و فرائض پر ایک مفصل تبصرہ تو ضرور ملے گا لیکن بشریت کے خدوخال نمایاں کرنے کی بہت کم کوشش ہے۔ شاید حالی نے اس کی طرف توجہ کم اس وجہ سے دی کہ اس میں انھیں چالیس برس تک کوئی کرشمہ نظر نہیں آیا جیسا کہ دوسری بڑی شخصیات میں ابتداء ہی سے کرشمات جھلکنے لگتے ہیں۔ حالی دیباچے کے اخیر میں قارئین کی توجہ مبذول کرتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۔ مشیر احمد علوی ناظر کا کوروی۔ علی گڑھ تحریک اور ادب، پنہ، ۱۹۹۹ء، ص ۸۵-۸۲

”اب دیباچہ کو ختم لرتے ہیں اور ناظرین کی خدمت میں التماں کرتے ہیں کہ کتاب کے مطالعہ کے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ دنیا میں بڑے سے بڑے آدمیوں کی زندگی بظاہر اس طرح شروع ہوتی ہے جس طرح عام آدمیوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اس میں کوئی کرشمہ ایسا صاف اور صریح نظر نہیں آتا جس سے ان کی آئندہ زندگی کی عظمت کا سراغ لگ سکے لیکن جب ان کی اعلیٰ قابلیتوں کے جو ہر بتدریج اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ جو معمولی باتیں ان کی ابتدائی حالت میں ناچیز اور کم وزن نظر آتی تھیں وہی ان کی آئندہ ترقیات کی بنیاد تھیں پس اس معزز لائف کی وہ عظمت جس کی طرف دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے، آغاز کتاب میں ڈھونڈنی نہیں چاہیے بلکہ اس موقع کا منتظر رہنا چاہیے جہاں سر سید کی ترقی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ جو کچھ ان سے چالیس برس بعد ظہور میں آیا وہ اس کے لیے بچپن ہی سے تیار ہو رہے تھے ہے۔“

اظاہر اس کا دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ سید احمد خاں کہاں تک اپنے مشن میں حق بجانب تھے اور کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے۔ چونکہ بشریت کا بے نقاب کرنا نہ ان کے مقاصد میں تھا اور نہ انہوں نے اس کی کوشش کی۔ حالی کا جو غایت اصلی تھا وہ اس میں کامیاب ہیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کا خیال ہے کہ:

”اگرچہ ہم ضرورت سے زیادہ یورپ اور ان کے اصول تنقید کی نقابی کو پسند نہیں کرتے لیکن بہ ایں اعتبار کہ خود حالی نے خود اس طرز سوانح نگاری کو سراہا ہے یہ کہنا بے جا نہیں کہ انگریزی زبان

کی بعض عمدہ سوانح عمریوں میں بڑے بڑے ہنگاموں اور معروکوں کی زندگی کے میں سطور میں مصنفوں کو "بشریت" کی جو رنگینیاں نظر آئی ہیں اور بشری محاسن و مصائب کے جو خصائص ان کو مل سکے ہیں وہ انہوں نے بلا تکلف اپنی بیانات میں درج کرتے ہوئے اپنے موضوع کی "شخصی" اور "ذاتی" "زندگی کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔<sup>۱</sup>

حیات جاوید میں دلچسپ ذاتی اور بشری جزئیات کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے حالانکہ ان کے ذریعے سوانح کو پر اطف بنا لیا جا سکتا تھا۔ لوکہارت کی "لائف آف اسکاٹ" اور باسول کی "لائف آف جانس" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں روزمرہ کے معمولی واقعات سے زندگی کے خاکے میں خوبصورت رنگ بھرا گیا ہے لیکن حالی کی کتاب ان بیل بولوں سے بہت حد تک خالی ہے۔ بچپن کے مطابق جو کچھ لکھا گیا ہے یا شاید عنقاں شباب کا حال بے شک پر اطف ہے۔ اخلاق و عادات اور طرز تصنیف و تالیف کا باب دلکش ہے۔

سید عبد اللہ نے سر سید کی زندگی کے بعض ان واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے ان کی ذات ہمیشہ سے بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا محل بنی ہوئی ہے۔ حیات جاوید کی تاویلات و توضیحات کے باوجود ادب بھی عوام میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے درج کردہ اختلافی مسائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ایام غدر میں سید صاحب کا طرز عمل

۲۔ سید صاحب کا مغربی تمدن کو پسند کرنا اور اس کے بعض پہلوؤں کو اختیار کر لینا۔

۳۔ سید صاحب کا مذہب کو معقولات کے تابع کر دینا اور بعض ایسے عقاید کا انکار جو مسلمات میں سے تھے اور بعض کا اقرار جو دین میں پہلے موجود نہ تھے۔

۱۔ سید عبد اللہ۔ فروع اردو حالی نمبر حصہ دو، لکھنؤ جون ۱۹۵۹ء، ص ۳۸۲

۲۔ سید عبد اللہ۔ فروع اردو حالی نمبر حصہ دو، لکھنؤ جون ۱۹۵۹ء، ص ۳۹۰

۴۔ سید صاحب کا آخری عمر میں سید محمود کے ہاتھوں میں کھینا اور پرانے رفقاء سے اختلافِ رُشْتی بل کے واقعات۔

۵۔ سید صاحب کا اندرین نیشنل کانگریس سے الگ رہنا اور مسلمانوں کے لیے الگ سیاسی حکمت عملی کا وضع کرنا۔

سید عبد اللہ نے مندرجہ بالا امور کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے حیات جاوید میں مذکور حالی کی آراء پر تقدیم کی ہے۔ بعض جگہوں پر وہ مصنف سے اتفاق کرتے ہیں اور بعض مقامات پر انھیں تقدیم کا نشانہ بناتے ہیں۔ مثلاً وہ مولانا حالی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایام غدر میں سید صاحب نے عاقبت میں کے خیال سے نہایت دیانتدارانہ بھی ضروری سمجھا کہ با غیوب کی مخالفت کی جائے۔ سر سید نے مغرب اور مغربی تمدن سے محبت اور اس سے وابستگی کی وجہ سے جو ”لباس و طعام و مکان اور طرز ماندو بود اور طرز معاشرت“، وغیرہ انگریزی طریقے پر اختیار کر لیا تھا حالی اس کو ”تعلیم یافتہ ترکوں کا طریقہ“ کہتے ہیں۔ حالانکہ حیات جاوید میں ترکوں کی محبت کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ سید عبد اللہ کے مطابق

”یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ہیرو کے بعض عیوب یا بعض خصائص کو اچھے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔“ (۱)

جبکہ مولانا حالی نے کسی کمزوری کا ذکر کیا ہے اس کے بعد ”لیکن“ لکھ کر کمزوری کو محاسن میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید صاحب کے اکثر اجتہاد سے حالی کو اختلاف تھا اور ان کے نزدیک سر سید غلطی پر تھے لیکن اس کو ظاہر کرنے میں چشم پوشی کو روک کھا گیا ہے۔ حیات جاوید میں جو پاس ادب ملحوظ ہے وہ دراصل مشرقی عقیدت اور خاطرداری کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ مولانا حالی پر بحیثیت سوانح نگار یہ اعتراض بجا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سر سید کو مختلف معاملات میں حق بجانب نہبرانے کے لیے جو تاویلات پیش کی ہیں یہ کام ان کے فرائض سے خارج تھا۔

حالی حیات جاوید میں سر سید کو بحیثیت مصلح، مجدد یا ریفارمر اتنی اوپنجائی پر

۱۔ سید عبد اللہ۔ فروع اردو حالی نمبر حصہ دوم، لکھنؤ جون ۱۹۵۹ء، ص ۳۹

بُخاتے ہیں کہ وہ علماء سلف کے کارناموں کو تھکرایتے ہیں۔ وہ سر سید کی محبت کے جوش میں یہاں تک کہہ گئے کہ:

”علمائے سلف میں سے کسی شخص نے عام اصلاح کا ارادہ نہیں کیا یا۔“

حالانکہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔

اس کتاب میں سر سید کے ساتھ قوم کی ذہنی زندگی کی پوری تصوریہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ سید عبد اللہ نے مقدمہ حیات جاوید میں لکھا ہے:

”یہ سر سید کی لاکف ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ایک ہنگامہ خیز صدی کی تاریخ بھی ہے۔ ابتدائی خاندانی حالات سے لے کر یوم وفات تک ہمارا مصنف ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنے ہیرود کے ساتھ ساتھ گھومتا نظر آتا ہے۔ وہ سر سید کی حد درجہ مصروف زندگی کے کسی کار آمد لمحے میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔“

اور آل احمد سرور بڑے جامع انداز میں بیان کرتے ہیں کہ:

”اس میں صرف سر سید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آگئی ہے۔ حالی نے تمام مواد کو سینئنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال کہ سر سید کے تمام کاموں کا محرك مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا، بالکل صحیح ہے اور انہوں نے سر سید کی مذہبی خدمات پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے زیادہ ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرود کی نفیات کو اچھی طرح سمجھنہیں سکتا۔ حالی کے یہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو مل مذاہی یا کتاب المناقبت اور یک رخی تصوریہ کہا گیا۔ حالانکہ سوانح نگاری میں یہ سنگ راہ کا

۱۔ حالی حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۳۷۷

۲۔ سید عبد اللہ۔ مقدمہ حیات جاوید، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۳۰

کام دیتی ہے۔<sup>۱</sup>

حالی سوانح نگاری کے مغربی اصولوں سے واقف تو معلوم ہوتے ہیں مگر انھوں نے مغربی اصولوں کو مناسب نقد و جرج کے بغیر صحیح اور درست تسلیم کر لیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ سوانح عمری میں کسی کو کچھ ثابت کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سوانح عمری کو سراپا کچھ ہونے کا نام ہے۔ سر سید ایک سچے آدمی تھے۔ اس کا اعلان بالکل بجا اور درست ہے مگر حالی کی طرف سے سر سید کی سچائی کا یقین دلانا ایک ایسی بات ہے جس پر بجا طور پر اعتراض ہو سکتا ہے۔

حالی نے سر سید کے رفقاء کو سر سید کا بڑا مد دگار لکھا ہے لیکن ضرورت ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کی تھی۔ مولوی عبدالحق اور شیخ اکرام دونوں نے ان کی بعض کمزوریوں کا ذکر کیا ہے اور یہ کمزوریاں قومی معاملات پر اثر انداز ہوئیں۔ ان کی بسا اوقات حد سے بڑھی ہوئی مصلحت بھی مضر ثابت ہوئی۔ اسی طرح وقار الملک کی سیرت کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر علی گز ہتھریک کے خدوخال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ محسن الملک کے بر عکس وقار الملک میں قدامت، وقار اور کھراپن زیادہ تھا۔ ان کی بہت سی خصوصیات سر سید کے مثالی تحیں لیکن ذاتی جذبات پر قومی مفاد اور وقت کی ضرورت کو ترجیح دینے میں وہ سر سید سے پیچھے تھے۔ غرض کتاب میں سر سید کے رفقائے کا رکا سلسلہ بھی مناسب طریقے سے قائم نہیں رہا اور نہ کسی کا درجہ واضح طور پر متعین ہو سکا ہے۔

سر سید کے معتقدین کا ذکر بھی شاذ و نادر ہی کیا گیا ہے۔ تمام اختلافات مذہبی کو بھی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ تمدنی اور سیاسی اعتبار سے جو لوگ سر سید کی مخالفت کرتے تھے اس کا کیا سبب تھا؟ مولانا حالی نے ان اختلافات کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی ہے مگر ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ مصنف نے معمولی اختلافات کو جگہ دی ہے اور اس طرح تناسب قائم نہیں رکھا ہے۔ مثلاً پنجاب کا اخبار رفیق ہند جو سر سید کا پہلے موافق تھا اور پھر مخالف ہو گیا تھا۔ اس طرح بعض دوسرے معمولی اخباروں کی مخالفت کا ذکر

کر کے معمولی باتوں کو اہم اور بعض سنجیدہ مخالفتوں کو معمولی بنادیا جس کی وجہ سے تحریک سر سید کے بعض کمزور پہلو پوری طرح واضح نہ ہو سکے۔ ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان تمام پہلوؤں کا جو سر سید کی لائف سے متعلق تھے یا ہو سکتے تھے، جائزہ لینا ضروری تھا اور انھیں دلچسپ انداز میں پیش کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ پھر ان تحریریوں کو جو سر سید کی مخالفت میں شائع ہوئی تھیں یا خطوط کی شکل میں خود سر سید تک پہنچی تھیں، ان کے بعض ضروری اقتباسات کتاب میں درج ہونے چاہیے تھے تاکہ قوم اپنی ہنری کیفیت کو خود اپنے آئئے میں دیکھ سکتی۔

آخر میں حالی کے اسلوب بیان پر جو حیات جاوید جیسی شخصیت کتاب میں ابھر کر سامنے آیا ہے، اظہار خیال ضروری سمجھتا ہوں۔ حیات جاوید کے اسلوب میں متانت چھٹکی ہے اور استدلال کا پہلو حاوی ہے۔ فقرے سادہ لیکن طویل، بیان منطبقانہ، مدلل اور تحریر سے صداقت، خلوص، ہمدردی اور یکسانیت ظاہر ہوتی ہے۔ باوجود سادگی کے اس میں وہ دلکشی نہیں ہے جو ایک سوانح کو ناول کی طرح پر لطف بنادے۔ یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ انہوں نے اپنے عام اسلوب کو با تھے سے نہیں چھوڑا۔

حالی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ وہ اسلوب بیان میں سر سید احمد خاں کے مقلد تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا اسلوب بیان بعض صورتوں میں سر سید کے اسلوب بیان سے یقیناً ممااثر رکھتا ہے مگر ان کے طرز نگارش کی چند باتیں ایسی ہیں جو سر سید کے بیان میں ہرگز موجود نہیں۔ سید عبد اللہ نے سر سید کے اسلوب کی اُن تین خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو حالی کے اسلوب میں ملتی ہیں اور وہ ہیں سادگی، منطبقیت اور بے تکلف اظہار۔ اس کتاب میں الفاظ کی تکرار بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ عبارت کی روائی اور سلاست کی راہ میں یہ تکرار روزاً بن جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حالی نے انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جہاں تک زبان کی وسعت کا سوال ہے اس میں حالی حق بجانب تھے کیوں کہ دنیا کی ہر زبان دوسری زبانوں سے الفاظ لیتی ہے اور اس طرح اپنے دائرہ الفاظ کو وسیع کرتی ہے لیکن یہ ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب

اس زبان میں اس کے تبادل الفاظ نہ ہوں۔ حالی نے اس کے برعکس وہ الفاظ بھی استعمال کئے جیسے جن کے لیے اردو میں الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً پلٹیکل، آرگن، ہسٹری، فیکٹری، اسٹریٹ، پریسڈنٹ، ریڈرس، ڈیپوٹیشن وغیرہ۔ اردو کے قارئین کے لیے یقیناً یہ الفاظ غیر مانوس ہو سکتے ہیں۔

سید عبد اللہ حالی کے اسلوب بیان میں جوش بیان کی کمی کو بڑے جوش کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہ الفاظ بہترین ادبی چاشنی سے معمول ہیں:

”ان کی تحریوں میں جوش بیان کی خاص کمی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جذبات سے معززی ہیں کیونکہ ان کی غزل اور ان کی مسدس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ احساس اور جذبے کی ان دولتوں سے مالا مال ہیں جو ایک شاعر کو ودیعت ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی نشر کو پڑھ کر بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قلب زندگی کی سب حالتوں میں ”یک رنگ“ سارہتا ہے۔

ان کے یہاں جزر ہی جزر ہے مدنہمیں۔ ان کی دنیا میں گرمیوں کی دوپہر بھی نہیں آتی۔ ان کے نظام زندگی میں نہ گہری تاریکی ہے نہ چندھیادینے والی روشنی۔ مدھم روشنی اور مل گجا اندھیرا ہے۔ ان کے یہاں نہ قبیبہ ہیں نہ فریادیں۔ ایک دردمند آدمی کا میٹھا میٹھا تبسم ہے اور بس۔ غرض زندگی کی شدید حالتوں کا احساس تو ہوتا ہو گا مگر اس کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔“

مختصر ایک فقرے سادہ مگر طویل ہیں، بیان منطقانہ اور مدلل ہے، تحریر سے صداقت، خلوص، ہمدردی اور یک رنگی ظاہر ہو رہی ہے۔ ہر ہر پیر اگراف میں حالی کی شخصیت جھلک رہی ہے۔ تفصیل اور جامعیت کے لیے مصنف بے قرار نظر آتا ہے۔ ان کے ہر پیر اگراف میں معلومات کے ذخیرے ہوتے ہیں۔ ان کی عبارتوں میں پر سکون روانی ہوتی ہے۔

دماغ کو ان کے پڑھنے سے بہت سکون ملتا ہے۔ خیال کی دنیا بالچل کم پیدا کرتی ہے۔

بھیتیت مجموعی حیات جاوید اپنی خامیوں کے باوجود موجودہ فن سوانح نگاری کے لحاظ سے اردو کی ایک بہترین سوانح عمری ہے۔ سر سید اور ان کے عہد کے مطالعے کے سلسلے میں کوئی شخص اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اب رہایہ سوال کہ حیات جاوید کو وہ شہرت و مقبولیت کیوں نہ حاصل ہوئی جو اس کے ہیر و اور مصنف دونوں کے شایان شان ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے شیخ چاند لکھتے ہیں:

”بات یہ ہے کہ سر سید کو ہم نے قرب زمانی کی وجہ سے نہایت بے دردی سے بھاولیا ہے اور نہایت ناشکری کے ساتھ اس کے انقلاب انگلیز احسانات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اب رہا مصنف کے کارنامے کی طرف سے تغافل تو اس میں ایک حد تک خود تصنیف کا بھی قصور ہے۔ یہ اس قدر شخصیم کتاب ہے کہ کسی کو اس کے مطالعے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک اور سبب اس کی طرف سے بدگمانی کا ہے۔ اس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ اس میں سر سید کی تصویر کا ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ حالی نے صرف سر سید کے مناقب و محسان بیان کئے ہیں اور معاقب و نقائص پر پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ گویا حالی کو فتنی نقائص کا الزام دینا ہے۔ اس الزام کی تاریخ تاریکی میں نہیں بہت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔“



## باب چہارم

### خلاصہ

سوائخ نگاری اردو ادب میں وہ صنف نثر ہے جس میں کسی ایک معینہ شخص یا اشخاص کی زندگیوں کے حالات پیدائش سے لے کر موت تک بیان کئے جاتے ہیں اور جن کے کارناموں پر روشنی بھی ذاتی جاتی ہے۔ جدید اصولوں کے مطابق سوائخ حقائق پر منی ہوتی ہے اور حقائق سے الگ ہٹ کر اس میں تجھیات کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اس میں او بیت اور حسن ترتیب و حسن انتخاب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ عموماً بڑی شخصیتوں کو ہی سوائخ کا موضوع بنایا جاتا ہے اور سوائخ لکھنے کا ایک بڑا مقصد بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے مطالعے کے ذریعے بڑے انسانوں کی زندگیوں کے شیب و فراز سے سبق حاصل کیا جائے اور اسی کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو قابل عمل بنایا جائے۔ سوائخ نگاری میں شخصیت یا ہیرود کے انحصار کو پیش کیا جاتا ہے جن سے اس کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہو۔ اردو سوائخ نگاری نے انگریزی سوائخ نگاری سے بہت استفادہ کیا ہے۔

باسوں جو انگریزی کا سب سے بڑا سوائخ نگار مانا جاتا ہے، جانسون کی سوائخ لکھ کر اس نے فن سوائخ میں ایک نیا انداز پیدا کیا۔ اس میں بیان کردہ ہر واقعہ خود بولتا ہے کیونکہ باسوں نے ذاتی تاثرات سے احتراز کیا ہے۔ اس کے برخلاف اردو سوائخ عمریوں میں جگہ جگہ مصنف کے ذاتی تاثرات نے فن سوائخ کو کافی مجروح کیا ہے۔

سوائخ نگار کا ہیرود اس کا معاصر بھی ہو سکتا ہے اور غیر معاصر بھی۔ معاصر ہونے کی صورت میں سوائخ نگار براہ راست ہیرود سے اپنے ذاتی ربط، ہم عصر لوگوں کے تاثرات اور ہیرود کے ذاتی و سماجی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے مواد کو کیجا کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں سوائخ لکھنے والا سخت امتحان سے گزرتا ہے کیونکہ واقعات و حادثات

کے انبار سے اسے ضروری اور متعلقہ چیزوں کو ہی پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہیر و سوانح نگار کا ہم عصر نہیں ہے تو اس کو تاریخ، وقائع، خطوط، یادداشتوں، روزنامچوں، ڈائریوں اور اس عبد کے دوسرے افراد کی سوانحوں سے بھی معلومات حاصل کرنی ہوتی ہیں۔ یہاں وہ ضرورت کے لحاظ سے اپنے منطقی استدلال، تعمیل یا قیاس سے بھی مدد لے سکتا ہے۔ مواد کی فراہمی کے دوسرے ذرائع میں خود ہیر و کے گفتار و کروار، خطوط، اقوال و امثال اور اطائف و ظرافت سے بھی مدد لی جاتی ہے نیز دوسری کتب اور اردو اخبار و رسائل کا سبک اسی ایسا جاتا ہے۔ سوانح کے مواد میں ہیر و کی خودنوشت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ موضوع کی ہو بہو تصور یا پیش کر دے، ہر واقعہ کو غیر جانبداری سے دیکھے اور اصولاً کسی بھی خوبی یا خرابی سے صرف نظر نہ کرے۔ یہ صحیح ہے کہ سوانح نگار کو ہیر و سے ہمدردی اور انسیت ہونی چاہیے لیکن صرف اسی حد تک کہ سچائی اور صاف گوئی پر دھبہ نہ پڑے۔ سوانح میں ہیر و کی معمولی جزئیات بھی اس کی سیرت پر اثر ڈال سکتی ہیں اس لیے انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

سوانح محض تاریخ نہیں کیونکہ اس میں تاریخ سے مدد لی جاتی ہے۔ سوانح میں تاریخ، فرد و احمد اور ادابی چاشنی کی آمیزش ہوتی ہے۔ تاریخ میں حقائق کا بیان خشک انداز سے ہوتا ہے اور اس میں اجتماعی زندگیوں کا بیان ہوتا ہے جبکہ سوانح میں شخصی رشته کی کار فرمائی ہوتی ہے۔

سوانح نگار کی شخصیت ہیر و کی شخصیت سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اسی پر سوانح کی کامیابی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ایمرسن کے مطابق ایک عظیم آدمی کی ضرورت ہے تاکہ ایک عظیم تر آدمی کی تشریح کر سکے۔ گرچہ سن سوانح نگاری کا یہ ایک تقاضا ہے لیکن اسے ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو اس شرط کو پوری نہیں کرتیں پھر بھی اچھے معیار پر پہنچتی ہیں۔ مثلاً باسول کی حیات جانسن جو دنیا کی بہترین سوانح عمریوں میں سے ایک ہے۔

سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ محض خارجی افعال کی وقائع نگاری کے بجائے شخصیت کی اندر ہونی فطرت و نفیاں کو سامنے لانے کی کوشش کرے۔ اسے ہیر و کے

افعال اور اس کی اصلیت و حقیقت کے درمیان رشتے کو بھی واضح کرنا چاہیے۔ لیکن اس عمل میں سے کسی طرح کی جذبائیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ عقیدت و احترام میں ایسا ہو سکتا ہے کہ ہیر و کی یک رئی تصویر بھلک اٹھے لہذا سوانح نگار کو اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

ادب میں طرز ادا اور اسلوب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ سوانح نگاری میں اسلوب ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ مواد کی فراہمی کے بعد اس کو سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل فن کاری ہے۔ اس میں نہ تو تاریخی خشکی کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناول و ڈرامے کی طرح تخيلاتی و حیاتی رنگ کی۔ اس کے بجائے حقائق کا بیان سادگی، تازگی اور شفافتگی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اسٹریچی سوانح میں ادبیت کو فوقيت دیتا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری اور سوانح عمری میں فرق یہ ہے کہ خودنوشت میں مصنف اپنے حالات خود قلم بند کرتا ہے جب کہ سوانح عمری کسی شخص کی کسی دیگر قلم کار کے ذریعے مرتب کی جاتی ہے۔ گرچہ دونوں کے اصول و ضوابط یکساں ہیں لیکن انداز مختلف ہوتا ہے۔ خودنوشت میں مصنف بعض واقعات کو پوشیدہ بھی رکھ سکتا ہے اور اس کا قلم جذبائیت سے پر بھی ہو سکتا ہے لیکن سوانح نگار ان چیزوں سے احتراز کرتا ہے۔ خودنوشت میں خود پرستی کا اندر یہ ہوتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ خودنوشت میں مصنف اپنے حالات کو بلا کم و کاست پیش کر کے باطنی اسرار و رموز سے بھی واقف کرائے۔

اردو سوانح نگاری کے آغاز کا گہرا رشتہ عربی اور فارسی سوانح نگاری سے ملتا ہے۔ عربی میں عبد اسلام میں بے شمار ایسی اصنافیں لکھی گئیں جن کے ذریعے مذہبی ضرورت کے پیش نظر راویوں کے کردار کی جاٹ پر کھوئی تھی۔ علاوہ بریں مسلم جنابوؤں، خلفاء اور فاتحین کی سیرت پر کتابیں لکھی گئیں۔ عربی سوانح نگاری اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں اعلیٰ سوانح عمری کے بہترین عناصر پائے جاتے ہیں۔ دراصل مصنفین حالات کے سلسلے میں نقہ و تبصرہ یا جرج کرتے وقت حقائق اور سچائی کی پاسداری کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ بھی جزئیات کو بھی بیان کر دیتے تھے۔ خصوصاً سیرت رسول پیش کرنے کا انداز لا اُق تحسین ہے۔ لیکن حالات کی زد میں سوانح نگاری کا یہ بہترین

اور جنی برحقیقت انداز جاتا رہا اور اس کی جگہ بے جامدح و ستائش نے لے لی۔ عربی میں تذکرے بھی لکھے گئے جن میں سوانح کے اجزاء منتشر ہوتے ہیں۔ مسلم حکمرانوں نے فارسی زبان پر اپنا اثر قائم کیا تو سوانح نگاری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ فارسی میں بھی تذکرہ نگاری کی بنیاد پڑی۔ مگر ان میں شعراء کے کلام کا انتخاب زیادہ اور ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ بعض میں تاریخی ترتیب، بعض میں تخلص کے لحاظ سے ترتیب کے ساتھ اور بعض میں جغرافیائی ترتیب کے ساتھ شعراء کے حالات کا بیان ملتا ہے۔ تذکروں کی اہمیت اس لحاظ سے مسلم ہے کہ سوانح کے ارتقاء میں یہ بے حد معاون ثابت ہوئے۔ تذکروں کے علاوہ فارسی میں مشاہیر سلف کی سوانح عمریاں بھی لکھی گئیں نیز ہندوستان کے مسلم فاتحوں اور فرمائیں رواوں سے متعلق کتابیں منظر عام پر آئیں مثلاً توزک تیموری، توزک بابری، ہمایوں نامہ اور توزک جہانگیری۔ انہیں صنف سوانح کے ذیل میں اس لیے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ ان میں یادداشت، روزنامچوں اور آپ بھتی کے مختلف عناصر بیک وقت پائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے دکن میں اردو کی نیم سوانح عمریاں منظوم لکھی گئیں۔ نشر کی دیر پا ترقی کی وجہ سے اس وقت نشری سوانحی تصنیفات نہیں لکھی جا سکیں۔ غرض ستر ہوئی صدی عیسوی میں اردو زبان نے شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے مختلف بکھرے عناصر کو مٹھویوں اور دیگر منظوم صورتوں میں پیوست کیا۔ اس سلسلے میں نصرتی کی مثنوی ”علی نامہ“ اور وہ بھتی کی ”قطب مشتری“، قابل ذکر ہیں۔ شمالی ہند میں بھی اس دور میں مر شیہ نگاری ملتی ہے جس میں غیر شعوری طور پر سوانح کے خط و خال مل جاتے ہیں۔ پھر اردو میں تذکرہ نگاری کی بنیاد پڑتی ہے۔ اردو تذکروں کا سارا انداز فارسی پر منحصر رہا۔ فارسی بھی کے طرز پر اردو شعراء کے تذکرے بھی لکھے گئے۔ ان تذکروں میں قیمتی سوانحی مواد تو ضرور ملتا ہے لیکن انھیں سوانح عمری کا نغم البدل نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ ان میں حالات و واقعات کی تفصیل کے بجائے مدح و ذم کا پہلو زیادہ غالب ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تذکرہ نگاری کے ذریعے تذکرہ نگاروں کو اپنی فصاحت و بلا غلت اور انشاء پردازی کا جو ہر دکھانے کا زیادہ موقعہ ملتا تھا۔ اس کا مقصد سیرت نگاری نہیں

تحا۔ اس سلسلے میں نہ تو کسی طرح کے اصول و نصواب تھے اور نہ ہی شعرا، کے انتخاب کے لیے شرائط تھے۔ بلکہ ہر تذکرہ نگار اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے لحاظ سے اپنی قابلیت کے جو بڑکھاتا تھا۔ اس کے باوجود ان تذکروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہمیں متعلقہ عہد کی تہذیب و تمدن، اقتدار، معاشرت، ماحول کے مشاہدات، سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کا پتا چلتا ہے۔ ان کی وجہ سے اردو زبان کے سرمایہ میں بھی انسانیہ بوا اور اسے توانائی مل گئی۔ ظاہر ہے سوانح نگاری کے ارتقاء میں ان تذکروں کو بھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تذکروں کے علاوہ دیگر ایسی اصناف بھی پائی جاتی ہیں جن میں بالواسطہ سوانح کے نقوش ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مہبی رنگ غالب تھا۔ اس کے بعد اردو یہ جدید سوانح نگاری کا دور شروع ہوتا ہے جو مغربی انداز پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ اس دور میں حالی اور شبی دو اہم اور باقاعدہ سوانح نگارا بھرتے ہیں۔ ان دونوں میں حالی کو بہر حال شبی پر فوقيت حاصل ہے کیونکہ انہوں نے فن سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو اپنی سوانح عمریوں میں برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ شبی کی کتابوں میں تاریخ و سوانح دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ عہد حالی میں سر سید اور عبد الحکیم شری کے نام اس طور پر اہم ہیں کہ ان کی بعض تصنیفات سے سوانحی اجزاء جڑے ہوئے ہیں۔

حالی نے روایت کے مطابق بچپن میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ انھیں تعلیم سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان میں فطرتاً شاعری کا ملکہ و دیعت کیا گیا تھا جس کو ان کے استاد غالب نے بھی سراہا۔ حالی نے قدیم شاعری پر جو تصنیفات اور غیر ضروری چیزوں کا پلنڈہ تھی، ختم تعمید کی اور سیدھی پچی باتوں کو اشعار میں ڈھالنے پر زور دیا۔ لا ہور میں بحیثیت ملازم وہ انگریزی ادب کے اردو تراجم سے واقف ہوئے اور مغربی لشی پر سے ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ سر سید احمد خان سے ملاقات کے بعد حالی ان کی شخصیت اور ان کے بلند مقصد سے بے حد متأثر ہوئے۔ حالی صحیح معنوں میں فرشتہ صفت انسان تھے۔ وہ حق پرست، حق گو، صاف دل اور منکسر و خاکسار انسان تھے۔ سر سید کی طرح انہوں نے مسلمانوں کو ان کی پستی، ذلت اور پسمندگی سے نکالنے کی بھرپور تداہیر

کیس۔ وہ قوم کے حد درجہ خیرخواہ تھے۔ وہ افادی اور مقصدی ادب کے قابل تھے اسی لیے انہوں نے اپنی کاؤشوں کو قومی و ملی فلاج کے لیے وقف کر دیا۔

حالی کی "حیات سعدی" (۱۸۸۶ء) اردو میں پہلی باقاعدہ سوانح عمری خیال کی جاتی ہے جو طرزِ جدید کی سائنسیک بائیوگرافی ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ سعدی کے ساتھ حالی کی ذہنی مہماں شہ نے اس کتاب کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی دوسری سوانح عمری "یادگار غالب" (۱۸۹۷ء) ہے جسے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ "حیات جاوید" (۱۹۰۱ء) سر سید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پیش کرنے والی حالی کے قلم سے نکلی ہوئی ایک بہترین سوانح عمری ہے۔ سر سید ایک مختلف النوع اور اختلافی شخص تھے اہذا ان کی زندگی کو پیش کرنا دریا کوکزے میں سمینے کے مصدق تھا۔ پھر بھی حالی نے فن سوانح کے اصول و ضوابط کی روشنی میں اس کو ترتیب دیا۔ گرچہ اس کتاب پر متعدد امتراضات کیے گئے ہیں اس کے باوجود اس سے آج تک اردو کی ایک بہترین سوانح عمری قرار دیا جاتا ہے۔ حالی کے بقول انہوں نے اس میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے جب کہ اپنی پہلی دونوں سوانح عمریوں میں زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے خامیوں پر انکلی اٹھانے سے پرہیز کیا ہے۔

حیات جاوید سے قبل اور سر سید کی وفات سے تیرہ برس قبل ایک انگریز کرنل گریتم نے سر سید کی لاٹ کو مرتب کر کے اسے شائع کر دیا تھا۔ حالی کے دوست مشنی سراج الدین نے بھی اس کے لیے مواد جمع کر کے ایک حد تک اسے مرتب کر دیا تھا۔ حالی نے ان دونوں مواد سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سر سید کے معاصر ہونے کی حیثیت سے دوسرے ذرائع سے بھی مواد یکجا کیا۔ ترتیب و انتخاب کے وقت انہیں بڑی مشکل پیش آئی۔ اس کے باوجود انہوں نے بخیر و خوبی اپنے کام کو انجام دیا۔ "حیات جاوید" دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں سر سید کی زندگی کے واقعات اور ان کے تمام کام ترتیب وار بقید تاریخ بیان کئے گئے ہیں۔ اس حصے کو چھ ابواب میں بانٹا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ سر سید کی ترقی کے اسباب کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس میں ابواب کے بجائے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ یہ حصہ مصنف کی علمی لیاقت

اور کمال مخت کا عکاس ہے۔ سر سید کے کارناموں کو حالی نے بڑی قدر و منزالت کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ انہوں نے سر سید کے بے مثال کارناموں کو حسن بیان کے ساتھ پیش کیا۔ ایسا کرتے ہوئے حالی نے صداقت و دیانت کا دامن با تھے سے نہیں جانے دیا۔ انہوں نے دل کھول کر سر سید کی عظمت کی دادی ہے لیکن واقعات کو جوں کا توں پیش کیا ہے۔ وہ سر سید کے عقیدت مند اور قد رداں تھے اور ان کی تحریروں میں بھی جمایت کا جذبہ بھلکتا ہے۔ فن سوانح کے لحاظ سے سوانح نگار کو موضوع سے عقیدت رکھنی چاہیے لیکن لکھنے وقت جمایت کا پہلو غائب نہیں آنا چاہیے۔ باسول کی "حیات جانس" اس کی عدمہ مثال پیش کرتی ہے۔ بلاشبہ حالی بھی ایک حقیقتی سوانح نگار کی تمام صفات سے متصف تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حالی کی اس کتاب پر جتنے زیادہ اعتراضات ہوئے جیسے اتنی ہی اس کی اہمیت نکھر کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ کسی کتاب کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے۔ اختلافات بجائے خود علمی کام کی طرف نشان دہی کرتے ہیں اور فی الحقیقت معیوب نہیں تمجھے جاتے مگر منافق اور دشمنی میں کسی پرنکتہ چینی کرنا اور چین کر کیزے نکالنا معیوب ہے۔

حالی نے کتاب کے پہلے حصے میں سر سید کے فنی ارتقا کو تفصیل سے نہیں واضح کیا ہے۔ انہوں نے کہیں کسی بڑے واقعہ کو اختصار سے بیان کر کے فنی کمزوری کا ثبوت دیا ہے اور کہیں معمولی لیکن حقیقتاً اہم واقعات کو تفصیل سے بیان کر کے فنی پختگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ پھر بھی انہوں نے شخصیت کے تاثر کو ہر جگہ قائم رکھا ہے۔ حالی کے مطابق سر سید کے بچپن کی زندگی دوسرے بڑے انسانوں کی طرح عظمت کی طرف اشارہ نہیں کرتی ہے بلکہ وہ عام انسانوں جیسی ہی تھی۔

"حیات جاوید" کے سب سے بڑے معترغ شبلی نے اسے "دل مداحی"، "کتاب المناقب" اور سر سید کی یک رخی تصویر بتایا ہے۔ شبلی کی نکتہ چینی کا یہ سخت انداز صرف اس کتاب کے لیے خود انھیں کی جانب داری کی طرف دلالت کرتا ہے۔ شبلی کی تصنیف کردہ سوانحی کتابیں المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور الغزالی تصویر کے دوسرے رخ کی کمی کی غماز ہیں۔ پھر سر سید کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کے لیے شبلی

اس قدر مصروف ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے سر سید کی خوبیوں کو ابھار کر دکھایا ہے اور خامیوں کو اچھا لانہیں ہے پھر بھی انہوں نے تنقیدی نظر سے کام لیا ہے اور سر سید کے عقیدت منداور مذاہج ہوتے ہوئے بھی ان کی خامیوں کو بیان کیا ہے۔ حالی بھی ایک انسان تھے لہذا غلطی کا سرزد ہونا ایک فطری بات ہے۔ ان کی پوری زندگی دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت جیسے اہم ستونوں پر قائم تھی ابذایہ بیان کہ عدم انہوں نے ایسا کیا ہے قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

شبلی کے دوست حبیب الرحمن خان شیروالی اور دیگر نقادوں نے بھی حیات جاوید پر متعدد اعتراضات میکے بعد دیگرے وارد کئے ہیں لیکن انہوں نے جوش تنقید میں اس ماحول اور مخصوص فضا کو فراموش کر دیا ہے۔ حالی کے پیش نظر ایک بڑا مقصد تھا۔ وہ ایک بڑے انسان کی سیرت کو پیش کر کے قوم کی اصلاح کے خواباں تھے۔ اسی لیے انہوں نے کتاب میں نتائج سے زیادہ بحث کی ہے۔ بشریت کو بے نقاب کرنا نہ ان کے مقاصد میں تھا اور نہ انہوں نے اس کی کوشش نہیں۔ جن امور میں سر سید کی ذات بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی محل بُنی ہوئی تھی حالی نے ان کا فصیلی جائزہ لیتے ہوئے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ یہ بات تعجب خیز نہیں ہوئی چاہیے کہ حالی نے اپنے محظوظ کی انظری عملی کوتا ہیوں کو بیان کر کے مصلحت آمیز بات کی ہے اور تاویلات بھی کی ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جسے اپنی محظوظ شخصیت کے لیے ہر انسان سحوآ کر بیٹھتا ہے۔

”حیات جاوید“ کا اسلوب منطقانہ، مدلل اور پختہ ہے۔ فقرے سادہ مگر طویل اور تحریر صداقت، خلوص، ہمدردی اور یکسانیت سے مملو ہے۔ حالی کے یہاں بے تکلف اظہار ملتا ہے جو زبان پر ان کی گرفت کو ثابت کرتا ہے۔ الفاظ کی تکرار بھی دیکھنے میں آتی ہے لیکن موضوع کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس سے احتراز ممکن نہ تھا۔ حالی نے انگریزی الفاظ کا بھی جا بجا استعمال کیا ہے۔ مختصر ایک ضخیم کتاب ہے لیکن سر سید کی زندگی اور کارناموں کا میاہ ہیں۔ گرچہ حیات جاوید ایک ضخیم کتاب ہے لیکن سر سید کی زندگی اور کارناموں کے مطالعے کے لیے اسے اولیت حاصل ہے۔ حالی نے اس سوانح کو ترتیب دے کر بعد کے سوانح نگاروں کو فن سوانح کو برتنے کا ہنر سکھا دیا جس کی تقلید آج بھی جاری ہے۔

## کتابیات

- ۱۔ اطاف حسین حالی، حیات جاوید، ترقی اردو ہیور و نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
- ۲۔ اطاف حسین حالی، حیات جاوید، اکادمی پنجاب (ٹرست)  
لاہور، نئی دہلی، متد ماز سید عبد اللہ، ۱۹۵۷ء
- ۳۔ اطاف حسین حالی، مقاالت حالی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء
- ۴۔ اطاف حسین حالی، مفصل حسین حالی، مرتبہ فتحی عبد الرحمن شوق امرتسری، لاہور
- ۵۔ اطاف حسین حالی، یادگار غالب (مرتب مالک رام) مکتبہ جامعہ، نئی دہلی لمبیڈہ
- ۶۔ اطاف حسین حالی، حیات سعدی، (مرتب مالک رام) مکتبہ جامعہ، نئی دہلی لمبیڈہ، ۱۹۹۲ء
- ۷۔ امیر اللہ خاں شاہزاد، فن سوانح زکاری اور دیگر مفصیلین، طاہر بک ایجنسی، دہلی، ۱۹۷۳ء
- ۸۔ امیر اللہ خاں شاہزاد، اردو اسالیب نشر تاریخ و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمبیڈہ، نئی دہلی
- ۹۔ انوار اکسن، مولانا حالی، لکھنؤ ادارہ فروع اردو، ۱۹۵۱ء
- ۱۰۔ جمیل جاہی، تاریخ ادب اردو جلد اول (آغاز سو ۵۰ تک)  
ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۱ء
- ۱۱۔ خنیف نقوی، شعراء اردو کے تذکرے (نکات اشعراء سے گلشن بے خار تک)  
شیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
- ۱۲۔ خورشید الاسلام، تقدیمیں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء
- ۱۳۔ ظیق احمد نظامی، سر سید اور علی گڑھ تحریک - ایجوکیشنل، پبلیشنگ ہاؤس ۱۹۸۲ء
- ۱۴۔ خان عبید اللہ خاں، مقالات یوم شلبی، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۷۱ء

- ۱۵۔ زبیر محمد امین، تذکرہ شمس العلما، خوبیہ حالی مترجم، اناوہ اسلامیہ بائی اسکول، ۱۹۲۵ء
- ۱۶۔ سید حامد حسین، نشر اور انداز نشر، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء
- ۱۷۔ سید عبد اللہ، میر احسن سے عبد الحق تک، چمن بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۰ء
- ۱۸۔ سید عبد اللہ، سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نشر کا فنی اور فکری جائزہ ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء
- ۱۹۔ سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے، ادارہ فروع اردو، لکھنؤ، ۱۹۰۶ء
- ۲۰۔ سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری، گلہ پبلیشنگ ہاؤس، کراچی، لاہور، ڈھاکہ ۱۹۶۰ء
- ۲۱۔ سید محی الدین (مرتب)، یادِ حالی، یعنی وہ مضمایں جو جشنِ صد سالہ یادگار پیدائش شمس العلما، خوبیہ الطاف حسین حالی کے موقع پر عثمانیہ کالج اور گنج آباد میں پڑھے گئے، جامعہ پرنسپلیس، دہلی
- ۲۲۔ سید عابد حسین، مضمایں عابد، کتابی دنیا لمبیڈ، دہلی، ۱۹۲۰ء
- ۲۳۔ سفارش حسین رضوی (مولفہ)، انتخاب حالی، مکتبہ جامعہ لمبیڈ، ننی دہلی، ۱۹۸۳ء
- ۲۴۔ شارب رو لوی، جدید اردو و تقدیم اصول و نظریات، اتر پردیش، اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء
- ۲۵۔ شجاعت خور شید الاسلام، تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۵۵ء
- ۲۶۔ صالح عابد حسین، یادگار حالی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۵ء
- ۲۷۔ صالح عابد حسین، حالی، ترقی اردو بیورو، ننی دہلی، ۱۹۸۳ء
- ۲۸۔ ضیاء الدین لاہوری، خودنوشت حیات سر سید، جنگ بلیشورز، لاہور، پاکستان، ۱۹۹۳ء
- ۲۹۔ طیبہ خاتون، اردو میں ادبی نشر کی تاریخ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۳ء)، مکتبہ جامعہ لمبیڈ، ۱۹۸۹ء
- ۳۰۔ ظہیر احمد صدیقی بدایوی، تحقیقی مطالعہ حالی، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- ۳۱۔ ظفر الدین، حالی، ترقی اردو بازار، دہلی، ۱۹۷۲ء
- ۳۲۔ عبد القیوم، حالی کی اردو نشر نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء
- ۳۳۔ فرمان فتح پوری، اردو نشر کا فنی ارتقا، ایجو کیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء
- ۳۴۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، سر سید کا علمی کارنیجی آل پاکستان، ایجو کیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۶۲ء
- ۳۵۔ کشمیری لاں ذاکر، ناشر نقوی (مرتبین) حالی اور سرزی میں حالی۔ ہریانہ اردو اکیڈمی، ہریانہ، ۱۹۹۲ء
- ۳۶۔ مہدی افادی، افادات مہدی، دیباچہ مولانا عبد الماجد، ۱۹۲۳ء

- ۳۷۔ مولانا وحید الدین سلیم، افادات سلیم، مرتب خلیق انجم، مکتبہ جامعہ لمبینہ، دہلی، ۱۹۹۳ء
- ۳۸۔ ممتاز فائزہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۳ء، ۱۹۷۵ء)
- ۳۹۔ محمد حبیب الرحمن خان شیر وانی، مقامات شیر والی، مرتب و طابع محمد منتدى خان شیر وانی، ۱۹۳۶ء
- ۴۰۔ موادی مہد الحق، چند ہم عصر، انجم ترقی اردو، پاکستان کراچی، ۱۹۵۳ء
- ۴۱۔ مشیر احمد علوی ناظر کا کورسی، علی گڑھ تحریک اور ادب اردو، خدا بخش اور میثل پیلک لاپسری، چمن، ۱۹۹۹ء
- ۴۲۔ نور الحسن باشی، احتشام میں رضوی، شجاعت سندھیوی (مرتبین) نقش حالی حصہ دوم، سرفراز قومی پر لیس بلکھنوا
- ۴۳۔ وہاں الدین علوی، اردو خود نوشت فن و تحریک، مکتبہ جامعہ لمبینہ، دہلی، ۱۹۸۹ء

## رسائل

- ۱۔ جنمات سہ ماہی مجلہ، حالی اور سرز میں حالی نمبر، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۹ء  
ادارہ تحریر کشمیری لال ذا کر، ناشر نقوی ہر یا شہ اردو اکیڈمی
- ۲۔ فکرونظر سہ ماہی حالی نمبر، اکتوبر ۱۹۹۱ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
- ۳۔ اردو سہ ماہی، اپریل ۱۹۵۲ء حالی نمبر، انجم ترقی اردو پاکستان، کراچی
- ۴۔ فروغ اردو حالی نمبر حصہ دوم، لکھنؤ، جون ۱۹۵۹ء،  
مرتبین: نور الحسن باشی، سید احتشام میں رضوی، شجاعت علی سندھیوی
- ۵۔ نقوش ادبی معرب کے نمبر، ستمبر ۱۹۸۱ء۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور۔
- ۶۔ فکرونظر۔ شبلی نمبر، جون ۱۹۸۲ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ



# **HALI KI SAWANEH NIGARI**

## **HAYAT-E-JAVED KI ROSHNI MEIN**

**MALIK RASHID FAISAL**

**EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE**

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAI KUAN, DELHI-6 (INDIA)

PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540

E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

